پابند و آزاد

رؤف انجم

حنیف

پابند و آزاد

○
○

رؤف انجم

پابند و آزاد

(مجموعۂ کلام)

عبدالرؤف انجم

مکتبۃ القریش

سرکلر روڈ — چوک اُردو بازار — لاہور

بار اوّل ———— مئی ۱۹۷۶ء

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— ۱۲ بارہ روپے

سرورق ———— حفیظ سرور

کتابت ———— محمد حسین چشتی

مطبع ———— پنجاب آرٹ پریس لاہور

ناشر ———— عبدالحفیظ قریشی

عنوانات

تعارف

عبدالرؤف انجم صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے استاد ہیں۔ اگر آپ اُن سے ملے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی گفتار میں نرمی ہے اور رفتار میں ٹھہراؤ۔ بالعموم خاموشی کی سی کیفیت کا مزا لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ سچ ہے جن کے من میں سُرور ہو وہ جلوت میں بھی راضی، وہ خلوت میں بھی خوش، ایسے لوگوں کی خوشی تالی نہیں پیٹتی اور غم نوحِ مزار نہیں بنتا ـــــ خوشی کی حالت میں معتدل راحت اور غم کے عالم میں پُرسکون اُداسی، اُن کے قیافے سے مجھے کچھ ایسا ہی اندازہ ہوا ہے ـــ ایسے لوگ زندگی کی مہمات کے باب میں جوشیلے اور تیز نہیں ہوتے، چنانچہ ناکامیاں ان کی دلشکنی نہیں کرتیں ـــ وہ کامرانی کا لطف بھی سہہ جاتے ہیں اور ناکامی کی تلخی بھی پی جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں اور نہ خودکشی کے پروگرام بناتے ہیں۔

آپ پروفیسر عبدالرؤف انجم صاحب کو ایک تھیلا بغل میں دابے کالج کے کسی برآمدے میں پائیں یا سیڑھیاں اُترتے، چڑھتے دیکھیں تو آپ کا پہلا تاثر یہی ہوگا کہ وہ کسی سوچ میں مگن ہیں اور مزا لے رہے ہیں ـــ ان کی محبّت بھری نظریں جو ان کے دل کا آئینہ ہیں عینک کے شیشے نے چھپا رکھی ہیں ـــــ قد پورا میانہ نہ سہی مگر ٹھیک ٹھاک ہے۔ ڈبلے نہیں مگر موٹاپے کا الزام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ رنگ گندمی نہ سہی مگر سانولا بھی تو نہیں ـــــ بالعموم برآمدے یا سیڑھیوں کے اس سفر میں ایک ہلکے سے تمباکو والا سگریٹ ان کا رفیق و ہمدم ہوتا ہے ـــــ مرحوم علاءالدین کلیم ناگاہ یاد آتے ہیں، وہ بھی نہایت ہلکے تمباکو والا سگریٹ نوش فرمایا کرتے تھے۔ مگر دوسری طرف ان کا حال یہ تھا کہ ؏

بگدازم آبگینۂ درساغر افگنم

علاءالدین کلیمؔ کیا پیارے رفیق تھے۔ اور کس طرح اچانک کھسک گئے، یاروں کے ساتھ چال چل گئے۔ خدا انہیں معاف کرے ـــــ

میں معافی چاہتا ہوں۔ انجم صاحب کے سگریٹ سے کلیم صاحب کا سگریٹ یاد

آگیا اور اپنے درد دل کا دھواں ان دونوں دوستوں کے سگریٹ کے دھویں میں جا ملا —
ہاں تو آپ انجم صاحب کو سگریٹ پیتے دیکھیں تو احساس ہوگا کہ سگریٹ بے خبری کی نذر نہیں ہو رہا بلکہ لطف لے لے کر پیا جا رہا ہے۔ دھواں شراب کی طرح کشید کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ وہ سال میں ایک سگریٹ مجھے بھی پیش کیا کرتے ہیں، کیا معقول خراج ہے جو میں اس مؤدب اور مہذب دوست سے وصول کرتا ہوں، دھواں منہ میں رکھتا ہوں اور اڑا دیتا ہوں مگر انجم صاحب کے ساتھ دو تین منٹ کا یہ دھویں کا تبادلہ ایک سرور سا چھوڑ جاتا ہے۔

انجم صاحب کو آج سے کوئی سولہ سترہ سال قبل لائلپور میں پہلی بار دیکھا تھا۔ عزیزی مفتی محمد لطف اللہ نے تعارف کرایا۔ انجم صاحب ان دنوں گورنمنٹ انٹر کالج لائلپور میں اُستاد تھے۔ کبھی کبھی کمپنی باغ لائلپور کے کسی "لان" میں احباب خوش گپیوں کے لیے جمع ہو جاتے تھے —— کوئی بیٹھا ہے کوئی لیٹا ہے۔ کوئی پورا دراز ہے، کوئی نیم دراز اور کوئی ٹہل رہا ہے۔ گپ کو اس سے کیا غرض کہ کوئی لیٹا یا کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چلتی رہتی تھی۔ یار باش لوگ ہی جانتے ہیں کہ یہ سماں کس بہار کا پروردگار ہوتا ہے۔ پھر ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں اکٹھے ہو گئے، ہم بہت کم ملتے ہیں، مگر کیا دوستی روز ملنے کی محتاج ہے؟

یہ انجم صاحب کی محبت ہے کہ اپنے پہلے مجموعۂ کلام کا تعارف مجھ ایسے نابلد شخص سے لکھوا رہے ہیں۔ میں نے کہا بھی کہ برادر یہ کام نقادوں کا ہے۔ فرمایا "نقاد وقاد میں نہیں جانتا۔ بس آپ ہی لکھیں گے"۔ چلئے، سر تسلیم خم، مگر قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ تنقید و نقید میں نہیں جانتا، اپنے تاثرات درج کر رہا ہوں۔

شاعری کے بارے میں بھی انجم صاحب کا رویّہ عجیب سا ہے، شعر کہتے ہیں مگر شاعروں سے یارانہ نہیں رکھتے بلکہ شعر کے باب میں مشتبہ حضرات سے بھی دُور دُور رہتے ہیں حتیٰ کہ میرے دوست ہونے کے باوصف مجھ سے نہیں ملتے، حالانکہ خدا گواہ اس طویل مدتِ دوستی میں "آغازِ الفت" کے دوران میں بھی ہماری ملاقات دوستانہ ہی رہی، شاعرانہ کبھی ایک بار بھی نہ ہوئی، نہ کبھی آج تک انہوں نے کچھ ارشاد کرنے کی مجھ سے فرمائش کی اور نہ مجھے کوئی ایسی انتقامی کارروائی کرنے کی ضرورت پڑتی —— مزید برآں یہ کہ انجم صاحب مشاعروں سے بھی دُور دُور رہتے ہیں۔ شریکِ مشاعرہ ہونا تو درکنار سامعینِ مشاعرہ میں بھی شاذ ہی

پائے گئے ہوں گے، میں نے انہیں اس لیے بھی ایسے مشکوک اجتماعوں میں نہیں دیکھا کہ میں خود وہاں نہیں جاتا، ان معنوں میں ان کی شاعری گویا ان کے "گھر کی لونڈی ہے" مطلب یہ ہے کہ

سرایں شیشہ فرو بند کہ بادے نخورد

ہاں مگر یہ تعارف والا مرحلہ تو بعد کی بات ہے، ہوا یہ کہ ایک روز فرمانے لگے "میں نے اپنی کچھ شعری خرافات جمع کی ہیں۔ آپ دیکھ لیں اور مشورہ عطا فرمائیں کہ وہ چھپنے کے لائق ہیں یا نہیں؟" —— حد ہے، شاعر اور یہ انکسار! اصل میں جو شخص شاعر تو کبھی کبھار، اور ذرا دیر کے لیے ہو اور استاد مسلسل رہے وہ بیچارہ زبانِ دعوے کہاں سے لائے، علمی ذوق آگاہ رکھتا ہے کہ درجے علم کے نہیں، درجے جہالت و ناآگاہی کے ہیں اور وہ بھی بیشمار، سوال یہ ہے کہ جہالت و ناآگاہی کتنے قدم پیچھے چھوڑی ہے، آگے دیکھو تو پھر وہی بیاباں، سمندر، کوہسار، آسماں در آسماں، سوچو تو سہی جو تم نے جانا وہ کیا ہے اور جو نہیں جانا وہ کیا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے۔ "وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا" —— (جو علم تمہیں دیا گیا ہے وہ تو نہایت ہی قلیل ہے) بالفاظِ دیگر تمہیں علم دیا ہی کتنا گیا ہے؟ —— لہٰذا کوئی سچا طالب علم یا کوئی حقیقی استاد خوش فہمی میں مبتلا ہو ہی نہیں سکتا، پھر بڑا بول بولنا —— یعنی چہ؟

جب میں نے رؤف انجم صاحب کا مجموعۂ کلام دیکھا تو خوشی ہوئی۔ کلام کے عمومی مزاج میں وہی لوچ، نرمی، ٹھہراؤ، تفکر اور صداقت کے عناصر ہیں۔ نہ کوئی دعوے نہ جوابِ دعوے، نہ کوئی نعرہ نہ جوابِ نعرہ —— ایک لیے دیئے رہنے کا اسلوب، راگ دھیمے، دھن مدھم، خوشی کی نرم رو، غم کی میٹھی آنچ —— احساس بالعموم ذاتی ہے، مراد ہے کہ وہ مضامین بالعموم ادھار نہیں لیتے اور نہ نقالی کے درپے رہتے ہیں۔ اور مزا تو اس میں ہے کہ ذاتی احساس کو یوں بیان کیا جائے کہ ہر شخص اسے اپنا احساس جانے اور اس طرح شخصی بات آفاقی معاملہ بن جائے —— لیکن یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شاعر کو اپنا احساس دوسروں کے دل میں منتقل کر دینے کی قدرت حاصل نہ ہو۔ غالبؔ کا "یہ بھی میرے دل میں ہے" اسی کیفیت کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔ البتہ کسی فارسی شاعر نے اس مضمون کو محبت تک محدود کر کے اس کی شوخی کو چار چاند لگا دیئے ؎

از بسکہ حرفِ عشق بہ لذت ادا کنم!　　ہر کس کہ بشنود شود ش ذوقِ عاشقی!

یعنی " میں محبت کی بات یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہوں کہ جو سُنے اسی کے دل میں محبت کا ذوق پیدا ہو جائے " اس کیفیت کو " یہ بھی میرے دل میں ہے" سے آگے کی بات کہا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ اپنی اپنی حدتِ احساس کا معاملہ ہے۔ اور اسی کے مطابق درجات ہیں۔ احساس کو متخیلہ کی کارفرمائی بیدار کرے، مشاہدہ اُکسائے یا کسی جذبے کی سرکشی جگا دے، شاعری کی روحِ رواں بہر حال یہ احساس اور احساس بھی وہ جو نازک و لطیف ہونے کے باوصف مضطرب بھی ہو اور بے آرام بھی، تیز بھی ہو اور بے قابو بھی ـــــ اور ہاں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب کسی صاحب احساس کو وسعتِ مطالعہ و مشاہدہ، ادبی ذوق ذہنِ رسا، زبانِ موافق اور قدرتِ اظہار میسر ہو تو وہ شاعری کر سکتا ہے۔ مگر حق بات یہ ہے کہ مشق و مہارت سے موزوں کلمات جوڑ لینا اور بات ہے اور شاعری چیزے دگر پھر جسے " شعریّت " کہا جاتا ہے وہ تو اس سے آگے اور بہت دُور آگے کی منزل ہے، شاعر پیدا ہی شاعر ہوتا ہے۔ اس کے خمیر میں کوئی جوہر ودیعت کر دیا جاتا ہے جو مناسب پرورش پائے تو نکھرتا چلا جاتا ہے باقی عوامل اور عناصر جن میں سے بعض کا اوپر ذکر ہوا اس وہبی جوہر کی امداد کرتے ہیں۔ مگر یہ " بیرونی امداد " کسی ناشاعر کو شاعر نہیں بنا سکتی۔ ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ اگر مولانا ابوالکلام شاعری کرنے پر مُصر رہتے تو ودیعت شدہ جوہر کے بغیر وہ شے کہاں سے پیدا ہوتی جسے " شعریّت " کہتے ہیں۔ ورڈزورتھ نے بھی اس راہ کی مشکلات بیان کی ہیں۔ وہ وہبی جوہر اور وجدانی مشاہدات کے باوصف " شعریّت " تک پہنچنے کی منزل کو ہر ایک کے بس کی بات نہیں مانتے۔ ان کے الفاظ ہیں :-

O, many are poets that are sown
By Nature, man endowed with highest gifts,
The vision and the faculty divine,
Yet wanting the accomplishment of verse.

میں بخلوصِ خاطر محسوس کرتا ہوں کہ شاعری کا جوہر انجم صاحب کے مزاج و طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن انجم صاحب کی طرف سے اس جوہر کو وہ توجہ عطا نہیں کی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ وہ زیادہ تر طلبِ علم میں منہمک رہے اور جب بھی اس اندرونی یا وجدانی کیفیت نے مضطرب کیا اسے ایک حسّی خلشِ خار سے زیادہ وقعت نہ دی؛ کوئی بھی فن ہو وہ محبوب کی طرح ہمہ وقتی توجہ چاہتا ہے اور زندگی کے دیگر ہر شغف سے رقابت رکھتا ہے، بقول غالبؔ ؏

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا

نتیجہ یہ کہ گو انجم صاحب نے شعر اسی طبعی اور وہبی جوہر کی سرکش لطافتوں سے مجبور ہو کر کہے لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کے اندر پرورش کے طلب گار اس شاعر کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا، چنانچہ اُن کا کلام پڑھتے ہوئے دونوں چیزوں کا احساس بیک وقت ہوتا ہے۔

انجم صاحب کی منظومات پابند بھی ہیں اور آزاد بھی، تین نظمیں انگریزی سے ماخوذ ہیں، غزلیں بھی ہیں۔ نظموں میں حمد بھی ہے اور نعت بھی، پابند نظموں میں "استفہام" "ساحل بحر پر" اور "چالیسویں سالگرہ" خاصے کی چیزیں ہیں۔ مگر پابند نظموں کے مقابل آزاد نظمیں زیادہ بھرپور ہیں —— ان کی نظموں میں یک رنگی و یکسانی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ منظر بدلتے ہیں۔ ان میں بنکاک کی روشنیاں بھی ہیں اور لندن کے تعصباتِ رنگ و نسل کے باب میں خدشات کے سائے بھی، خالص گھریلو محبت بھی ہے (جس کا اعتراف مشرقی شعرا عموماً کم ہی کرتے ہیں) اور وطنی اور ملّی لگاؤ بھی —— غرض نظموں میں مضامین کی رنگارنگی ہے۔ مگر فکری تضاد نہیں۔

انجم صاحب کی یہ نظمیں فی الجملہ جو اثر چھوڑتی ہیں وہ تقریباً یہ ہے کہ اس آئینے میں ایک بھلا آدمی سامنے آتا ہے، جو مَن کی تلاش میں مگن ہے۔ جو ایک سوسائٹی کا ذمہ دار فرد ہے جو ایک وطن کا باشندہ ہے اور جسے اپنا وطن عزیز ہے۔ جو ایک ملّت کا فرد ہے۔ جس میں بین الاقوامیت کی روح بھی کارفرما ہے —— مگر جو بین الاقوامیت میں غرق ہو کر اپنے وطن، اپنی ملّت اور اپنے دین سے غافل نہیں ہوتا، جس کے دل میں بہت سی الفتیں آباد ہیں تاہم ترجیحات واضح ہیں۔ درجات معیّن ہیں۔ جیسے کسی نے کہا ہے :-

Place for everything but everything in its place.

نظم کو آزاد کر لیجئے مگر رباعی یا غزل کا کیا کیجئے؟ وہ اصناف جن کی شناخت ہی ایک خاص پیکر کی بدولت ہے ان کا پیکر بدلیں تو وہ وہ نہیں رہتیں جو اصلاً اور اساساً ہیں۔ یہی باعث ہے کہ وہ شعراء حضرات جو نظم آزاد اور آزاد شاعری کے قائل ہیں۔ جب کبھی غزل کا رُخ کرتے ہیں تو بہر حال اُسے اس کے کلاسیکی سانچے ہی کے ساتھ قبول کرتے ہیں، پھر غزل کے علامات و رموز ہیں۔ جن میں جدید سے جدید صورتِ حال کو بیان کر دینے کی صلاحیت اور بیان کر کے نکھر جانے کی اہلیت موجود ہے —— حق یہ ہے کہ غزل معشوق مزاج صنف ہے۔ یہ تو کہنے والے پر منحصر ہے کہ غزل میں کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی وسیع مضمون قلمبند کرنا مقصود ہے یا کوئی کہانی یا مربوط نظریہ پیش کرنا مطلوب ہے تو اس کے لیے صنفِ نظم موجود ہے لیکن "ریزہ خیالی" کو خوش آہنگ بنانا ہو تو غزل سے کام لیا جا سکتا ہے۔ غزل کا پیکر قدیم ہے مگر وہ لباس تو جدید سے جدید قبول کر سکتی ہے البتہ ہر لباس کسی تناسب اور تناسق کا طالب ہے۔ ویسے غزل ہی پر کیا موقوف، کوئی بھی فن ہو اگر وہ واقعی فن ہے تو اپنی حدود کے اندر التزامی تناسب و تناسق کا مقتضی ہے۔ آپ چاہیں تو غزل کو از روئے اثر جامِ جم بنائیں۔ چاہیں تو تیرِ تیز دم اور چاہیں تو ایٹم بم، سلیقہ شرط ہے۔ اس لیے کہ آزادی پابند ہے اور پابندی آزاد —— (شاید اسی شعورِ لطیف کے ذہنی پس منظر میں انجم صاحب نے اپنی کتاب کا نام "پابند و آزاد" رکھا) —— دونوں کیفیتوں سے بطریقِ احسن نباہ کرنے کا مسئلہ ہی درحقیقت ہُنر کی امتحان گاہ ہے —— نیز یہ بھی واضح ہے کہ بعض اشخاص کو غزل کے ساتھ کوئی مزاجی مناسبت ہوتی ہی نہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مزاج کو پہچانیں اور جس جانب طبیعت راہ دیتی ہے۔ اس جانب متوجہ کریں، جن کی طبیعت غزل کو قبول کرتی ہے اُن سے لڑیں نہیں، نام نہ دھریں۔ آخر دنیا میں کتنی چیزیں ایسی ہیں جو بعض طبائع کو موافق نہیں آتیں۔ علاج اس کا یہ ہے کہ وہ طبائع انہی اشیاء کی طرف راغب رہیں جن کے لیے ان میں موافقت موجود ہے —— جس طرح بسیط معنیٰ میں کسی کا یہ کہنا درست نہیں کہ ہر وہ شے مٹ جانی چاہیئے جو میری طبیعت کو پسند نہیں، اسی طرح ادب میں اصناف نظم و نثر کے ضمن میں یہ حکم صادر فرما دینا مناسب نہیں کہ فلاں صنف میرے موافقِ مزاج

نہیں لہذا اسے مِٹ جانا چاہیئے ۔ اہلِ ذوق ، پسند و ناپسند اور وہ بھی فنی پسند و ناپسند میں اتنے متعصب نہیں ہوتے ۔

عبدالرؤف انجم صاحب اس معاملے میں بھی میانہ رو ہیں ، وہ آزاد نظم کے بھی رسیا ہیں اور غزل کے بھی ، وہ قدیم بھی ہیں اور جدید بھی ، وہ شخص جو ماضی سے قطع تعلق کرلے بقولِ کسے ایسا ہے جس کا حافظہ معاً ماؤف ہوگیا ہو ۔ اور وہ شخص جو حال سے بے خبر ہے وہ بے بصر ہے ، اندھا ہے ، پھر اگر ذرا غور کریں تو جدید اور قدیم کی بحث ہے کیا ؟ زمانہ کہاں سے جدید ہونا شروع ہوا ؟ علامہ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو جانتا ہوں ، شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں ۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کی دین ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبعِ موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُر اثر الفاظ تلاش کرے ۔ .. .. بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری ــــــ "

انجم صاحب کی غزلیں سلیقے سے کہی گئی ہیں ۔ وہ ذاتی جذبے کی بھی حامل ہیں اور ماحول کے اثر کی بھی واضح نشاندہی کرتی ہیں خواہ وہ ماحول ذوقیات کا ہے خواہ سیاسیات کا مجموعی طور پر غزلیں لطف سے خالی نہیں ۔ ان میں خاصے دلنشیں اشعار موجود ہیں ــــ میں آگاہ ہوں کہ میں نے نظم کے ضمن میں بھی اور غزل کے باب میں بھی اپنی پسند کے نمونے درج نہیں کیے ۔ اصل میں غالب نے یہ کہہ کے ڈرا دیا کہ ؏

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

قارئین اپنی پسند کے اشعار خود چُن لیں ۔ میں انہیں اپنی پسند سے آگاہ کیوں کروں ؟

پروفیسر محمد منوّر
شعبہ اُردو
گورنمنٹ کالج لاہور

حرفِ چند

ہر تخلیقی عمل تنہائی اور یکسوئی کا مقتضی ہوتا ہے۔ تجربے کے لیے البتہ تنہائی اتنی مفید نہیں۔ تجربے کے لیے فنکار کو اپنی ذات خارجی عوامل کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑتی ہے۔ لیکن ایک عام شخص اور فنکار میں یہی فرق ہے کہ عام آدمی تو اپنے آپ کو محض سیلابِ حوادث کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہے وہ طغیانی کی شدت یا بہاؤ کی نرم روی کا تو احساس رکھتا ہے مگر نہ تو اُسے اکثر منزل کا شعور ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی کوشش سے اپنے رُخ کو موڑنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس فنکار کو ہمہ وقت شعوری طور پر اور اکثر نیم شعوری طور پر یہ احساس رہتا ہے کہ وہ کدھر جا رہا ہے یا لے جایا جا رہا ہے۔ خارج کے واقعات اس کے باطنی احساسات سے ٹکرا کر ایک کشمکش اور اضطرار کی کیفیت کے خالق بنتے ہیں اور اسی کشمکش کے نتیجے کے طور پر وہ اپنے فن پارے کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کی ہر نظم کے پس پردہ معروضی تجربات اور داخلی احساسات کی جنگ اور دوستی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

یہ مجموعہ بھی خارجی عوامل اور داخلی کیفیات کے ٹکراؤ اور ملاپ کا نتیجہ ہے۔ میں ان نظموں اور غزلوں کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان سب کی تخلیق میں فنکارانہ خلوص اور جذبے کی صداقت کارفرما ہیں۔ جذبے کی سچائی البتہ جب لفظوں کے پیکر میں ڈھلنا چاہتی ہے تو زبان کی جبریت بعض اوقات رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہے اور کبھی کبھی تو لفظ بھی اپنی ناز برداری چاہتا ہے۔ چنانچہ لفظ جہاں مقصد کے قریب لے جانے کا ایک ذریعہ ہے وہیں یہ منزل سے دُور رکھنے کا بھی موجب بن جاتا ہے۔ یہ مفہوم کو پابند بھی کرتا ہے اور کبھی کبھی اصل حقیقت کی جستجو میں آزادانہ پرواز کر کے جذبے کو نئی منزلوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے تجربے کی صداقت اور پیرایۂ اظہار میں فاصلے اور دُوری کا ہونا کوئی نئی بات نہیں لیکن فنکار کی تسلی تبھی ہوتی ہے جب وہ ان فاصلوں کو کم سے کم کر دے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان فاصلوں کو میں نے سمیٹ لیا ہے تو یہ فخر و تعلی کا دعویٰ بے بنیاد ہوگا۔ اصل فیصلہ تو وہی ہے جو زمانے کی عدالت دے کیونکہ صرف یہی عدالت، جس میں قارئین اور ناقدین منصف ہیں صحیح فیصلہ دینے کی مجاز ہے۔

عبدالرؤف انجم

لاہور
۲۹ فروری ۷۶ء

منظومات

حمد

مالکِ بحر و بر خالقِ جزو و کل
تیرے تابع ہیں خاک آگ پانی ہوا
کس کو یارا کرے تیری حمد و ثنا

٭

وہ قلم ہیں کہاں کر سکیں جو بیاں
اک ترے نام کی ان گنت خوبیاں
ذات سے تو ہی اپنی ہے بس آشنا

٭

سلام بحضور نبئ آخرالزماں

(صلی اللہ علیہ وسلم)

وہ تھا زیرِ قدم جس کے شکوہِ قیصر و کسریٰ
وہ جس کے نام سے عالی نشاں ہے گنبدِ خضریٰ

وہ فخرِ انبیاءؑ، رُوحِ دو عالم، آیۂ رحمت
سلام اُس پر کہ جس کے مقتدی موسیٰ ہیں اور عیسیٰ

وہ تقدیرِ جہاں فرمانروائے ظاہر و باطن
سلاطینِ زماں جس کے یہاں خُدام ہیں ادنیٰ

وہ جس کے فیض کا چشمہ ازل سے تا ابد جاری
وہ جس کے واسطے کی حق نے دنیا خلق اور عقبیٰ

وہ ہے معراج جس کی خالق و مخلوق کی قربت
ہیں گردِ راہ جس کے سب سوادِ سدرۂ و طوبیٰ

وہ جس کو عرصۂ محشر میں خاص اذنِ شفاعت ہے
وہ سب کا حامی و ناصر وہ سب کا مامن و ماویٰ
وہ جس کی گردِ کفش پا پہ قرباں ماہ و انجم ہوں
سلام اُس پر کہ جو مخلوق میں یکتا ہے اور اعلیٰ

مناجات

میں نے تیرا نام پکارا دن میں پانچوں بار

پیٹ گرسنہ رکھا تا رُوح کو مل جائے غذا

داڑھی مونچھ بھنویں سر صاف کرا کے بھاگم بھاگ

تیرے در پہ برہنہ پاؤں برہنہ جسم گیا

اک تیری آواز نہ آئی تو تھا کہاں روپوش

مَیں نے تو وادی وادی تجھ کو لبیک کہا

سانس کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے نطق ہوا خاموش

سَر پہ تیغ اجل لٹکے پا میں زنجیرِ فنا

میدانوں میں گلہ بانی کرتے بیتی عُمر

اتر پہاڑوں سے اے مولا میرے سامنے آ

اے مولا اے میرے آقا مجھ پہ کرم فرما

✵

میں ہوں اسیرِ وہم و تشکک مجھ کو دے ایقاں

میں وہ جزو جو کُل سے بچھڑا مجھ کو تری تلاش
تجھ سے تعلق ٹوٹ گیا تو میرا وجود محال
میں اندھا گونگا بہرا ہوں مجھ کو ہوش کہاں
میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو سیدھی راہ پہ ڈال
شیشۂ دل سے گردِ باطل پھونک سے کر دے دُور
جلوہ نما اس میں ہو کوئی تو وہ ہو ترا جمال
جاہ و حشمت عزت و دولت فقر کے سامنے ہیچ
رکھ اپنے ہی در کا سوالی میرا یہی سوال
اے مولیٰ اے میرے آقا مجھ پہ کرم فرما

استفہام

مَیں کہتا ہوں "مَیں ہوں" تو میں ہوں پر نہیں معلوُم
مَیں کون ہوں کیا ہوں؟

*

ذرہ ہوں کہ صحرا میں بھی رہ کر ہوں جُدا میں
قطرہ ہوں مگر بحر کی وسعت میں نہیں گم
صرصر کے طمانچوں سے کبھی لرزہ براندام
موجوں کے تھپیڑوں سے کبھی خستہ و حیراں
اس وسعتِ افلاک میں جا میری کہاں ہے
میں کیوں ہوں کہاں ہوں

*

مہماں ہوں میں آیا تو نہیں لایا گیا ہوں
ساز ہوں مجبوس نہیں میں کہ نہ چل دوں

ہر چند کہ ماحول مخالف ہے ازل سے
پھر بھی قدم اٹھتے نہیں دروازے سے باہر
دہلیز پہ اِس سُوچ میں ڈوبا ہوں کھڑا ہوں
میں کیسے یہاں ہوں

*

بادل

دوشِ ہوا پہ رقص میں اِک پارۂ سحاب
گویا ہے برگ جس کا شجر آسمان ہے
برسے ابھی تو لوٹ چلے اپنی اصل کو
آخر خمیرِ خاک سے اُس کی اٹھان ہے

*

بنکاک میں ایک شام

بنکاک کا ہر ذرہ خورشید بداماں ہے
اِک نور کی بارش ہے ہر سمت چراغاں ہے

ہر ایک پری چہرہ ہے دعوتِ نظارہ
یہ حسن کا مسکن ہے یہ موطن خوباں ہے

ہر سمت ہی گاڑے ہیں خوشیوں نے پھریرے سے
اس شہر میں وہ آئے غم جس سے گریزاں ہے

آزاد منش، مخلص، بے مکر و ریا، سادہ
کالا ہو کہ گورا ہو انساں یہاں انساں ہے

پردا تو نہیں پھر بھی پردے میں ہر اِک بُت ہے
گو زُلف بریدہ ہے گو ساق بھی عریاں ہے

جلووں کی فراوانی دیدار کی ارزانی
جاں محو تماشا ہے دِل جسم میں رقصاں ہے

مے خانوں سے آتی ہے قلقل کی صدا ہر دم
جھرمٹ ہیں حسینوں کے کیا جشن بہاراں ہے

ہیں کتنے حسیں دلکش بتخانے برہمن کے
اَب سجدہ یہاں کیجے اب خطرے میں ایماں ہے

کیا خضر نے پایا ہے لاکھوں ہی برس جی کے
اِک پل جو یہاں گزرے صد چشمۂ حیواں ہے

اِس شہر میں کیا آئے جو کچھ تھا لٹا ڈالا
پاس عقل کا مایہ اب نے نقدِ دل و جاں ہے

گر وہ بھی یہاں ہوتے ہم اُن کو بھی دکھلاتے
اِس شہر کے کیا کہنے انجم بھی غزلخواں ہے

*

ساحلِ بحر پر

چند لمحات فرصت کے تھے مغتنم
دور ہنگامۂ شہر سے بھاگ کر
کس لیے آ گیا ساحلِ بحر پر بے سبب بے سبب

کھیلتے کودتے تیرتے لوگ تھے
کشتیاں ماہی گیروں کی اور بادباں
دُور اُفق پر بھی کچھ اُجلے اُجلے نشاں خوب تھے سب کے سب

جنت گوش تھے نقرئی قہقہے
اور پری پیکروں کی جواں ٹولیاں
خیرہ کرتی ہوئی کوندتی بجلیاں الاماں الغضب

حالت دِل پر اِک شے پہ تھی منعکس
سینۂ بحر پہ اِک تموج عیاں
جھاگ اڑاتا ہوا زورِ آبِ رواں مرتعش مضطرب

یاں بھی تنہائی لیکن میسر نہ تھی
گرچہ ہمدم نہ تھا کوئی نے ہمنوا
یونہی مبہم سا چاروں طرف تھا بپا ایک شور و شغب

دِل میں افسردگی اور خوشی ہر طرف
میرا ماحول سے ربط کوئی نہ تھا
اتنی رونق تھی لیکن میں تنہا رہا کس قدر تھا عجب

ایک بے نام خواہش نے انگڑائی لی
حسرتِ لمس دِل میں سمیٹے رہا
میں اُداسی کی چادر لپیٹے رہا منفعل بے سبب

تند ہوتی گئی تلخئ روز و شب
سوچتا تھا سکوں بھی ملے گا تو کب
دل کہ مایوسیوں سے ہوا جاں بہ لب

خواہش، حسرتیں حملہ آور ہیں کیوں
اس بڑھاپے میں اب مجھ میں رکھا ہے کیا
اس بڑھاپے میں دامِ ہوس سے بچا میرے رب میرے رب
میرے رب میرے رب!

٭

عزمِ نو

تاریکیٔ حیات کا درماں کریں گے ہم
اشکوں سے اپنے گھر میں چراغاں کریں گے ہم

اُجڑیں گے اس طرح کہ انہیں ترس آئے گا
ویرانیوں کو اپنا نگہباں کریں گے ہم

تاب و توانِ قلب و جگر آزمائیں گے
ہاں امتحانِ گردشِ دوراں کریں گے ہم

ان کے بغیر مرگِ مسلسل بنی ہے زیست
خود مر کے اپنی ذات پہ احساں کریں گے ہم

ہوش و خرد کو چھوڑ کے دامان و جیب کو
دستِ جنوں سے دستِ و گریباں کریں گے ہم

اُس جانِ گلستاں کی اگر ہے رضا یہی
خود کو رہینِ شامِ بیاباں کریں گے ہم

انجم مگر نہ بھول سکیں گے انہیں کبھی
گو اب نہ شکوۂ غمِ جاناں کریں گے ہم

٭

دیارِ غرب میں

رونقوں کے درمیاں ویرانیاں
روح کو ڈستی ہوئی تنہائیاں

رقص و مے نوشی کا ہر سو غلغلہ
حیف دادِ عیش کی ارزانیاں

ہم سخن کوئی نہ کوئی ہم زباں
اپنی قسمت نالہ و آہ و فغاں

واہمہ تھی لذتِ آوارگی
اور حقیقت تلخیاں ہی تلخیاں

بسکہ ہے پژمردہ پھر ذوقِ لطیف
عام ہے نظارۂ حسنِ بتاں

دوستوں کی مجلسیں وہ محفلیں
اجنبی گلیوں میں اب ڈھونڈیں کہاں

انجم اب ہے دورِ پیری اور ہم
قصۂ پارینہ ہے عہدِ جواں

٭

یادِ چراغ خانہ

وہی جو پیکرِ صدق و صفا ہے — وہی جو مرجع مہر و وفا ہے
جہاں میں سب سے بڑھ کر جو حسیں ہے — وہی جس کا کوئی ثانی نہیں ہے
وہی جو سیم تن ہے مہ جبیں ہے — نظر سے دُور ہے دل کے قریں ہے
وہ ہے دُنیا کی حورِ عین گویا — کہ جس گھر میں ہے وہ خلدِ بریں ہے

٭

وہ ہے اِک پیکر اخلاص و رحمت — ہے اس سے عشق بھی گویا عبادت
کہیں بڑھ کے ہے رُوحِ انگبیں سے — ہے ایسی اس کی باتوں میں حلاوت
تقدس میں ملائک سے ہے برتر — ہے عصمت جس کی گویا جانِ عصمت

٭

وہ نرگس چشم اور غنچہ دہن ہے
وہ از سر تا قدم گل پیرہن ہے

وہ جو غارت گرِ رنج و محن ہے
وہ جو خلوت میں بھی اِک انجمن ہے

وہ جس کی زُلف غرقِ عود و عنبر
دِل و جاں جس کے قدموں پر نچھاور

تمنائے دِل بے تاب و مضطر
کہ جس کی یاد ہے کیمیا رُوح پرور

خجل جس سے مہ و خورشید و انجم
ضیاء ہے باختر سے تا بہ خاور

وہ ہر محبوب عالم سے ہے بڑھ کر

✵

خط آنے پر

ملا ہے بعد مدّت آج ہمدم اک معطر خط
یہ تسکینِ دلِ ناشاد خط، یہ رُوح پرور خط

چمکتی نیلگوں کاغذ سے ہے تحریر کی شوخی
مرے خوابِ محبت کی ہے یا تعبیر کی شوخی

یہ پیغامِ تلطف یا تمنائے دلِ مضطر
دُعاؤں کا یہ حاصل ہے مری اُمید سے بڑھ کر

دلِ دردآشنا کے واسطے پیغمبرِ راحت
ہوا اس خط کے باعث اور محکم رشتۂ الفت

جسے دشوار سمجھے تھے وہ منزل ہو گئی آساں
یہ خط آیا مجھے دردِ محبت کا ملا درماں

یہ پیغام شفا لایا ہے زخمِ دلِ محزوں
خدا جانے کہ اس تحریر نے پھونکا ہے کیا افسوں

دلِ پُر جستجُو نے پا لیا ہے مدُعا اپنا
بفیضِ شوق مجھ کو مل گیا ہے آسرا اپنا

یہ خط کیا ہے حقیقت میں ہے تلمیحات کی دنیا
کسی زہرہ جبیں کے دل کے احساسات کی دنیا

ہر اک چھوٹے سے جملے میں چھپا سیلِ معانی ہے
یہ خط گو مختصر ہے پر بہت لمبی کہانی ہے

یہ خط در اصل اگلی پچھلی باتوں کا فسانہ ہے
یہ تجدیدِ محبت کے لئے گویا بہانہ ہے

وفورِ شوق کا شاہد ہے پیغامِ مسرت ہے
یہ نومیدی کی دنیا میں مسیحائے محبت ہے

اسی کاغذ کے پرزے پر مری تقدیر لکھی ہے
مرے نالوں کی آہوں کی یہاں تاثیر لکھی ہے

اسے محبوب کے قلب و نظر کا ترجماں کہیئے
اسے یا وعدۂ ترسیلِ خط کا پاسباں کہیئے

حریمِ غم کی تاریکی میں اس کو روشنی کہیئے
اے میرے لیے رُوحِ روانِ زندگی کہیئے

دعا ہے راہِ الفت میں یہ سنگِ میل ثابت ہو
اور اس سے کائناتِ عشق کی تشکیل ثابت ہو

کسی کے حسنِ فرخندہ کا یہ عنوان ہو جائے
اسی سے منزلِ الفت مری آساں ہو جائے

اسی خاموش خط سے عشق کی تجدید ہو جائے
پئے افسانۂ الفت یہ اِک تمہید ہو جائے

*

وطن لوٹنے پر

خُوب جی بھر کے انہیں پیار کریں گے جاکر
اپنے محبوب کا دیدار کریں گے جاکر
وہ نہیں پاس تو دل نخلِ خزاں دیدہ ہے
اس کو رشکِ گل و گلزار کریں گے جاکر
رنج و غم سے ہے فراغت تو جنوں پوشی میں
جامۂ فہم و خرد تار کریں گے جاکر
شعلۂ آتشِ ہجراں کو بجھانے کے لئے
چشمِ پر غم ہی گہر بار کریں گے جاکر
کوچۂ عشق میں احرامِ وفا باندھیں گے
پھر طوافِ لب و رخسار کریں گے جاکر
شانۂ دستِ طلب سے اسے سلجھائیں گے
خاطرِ زُلفِ طرحدار کریں گے جاکر

جاگتے جاگتے آنکھوں میں کٹی ہیں راتیں
اب انہیں نیند سے بیزار کریں گے جاکر
حسرتیں دل کی نکالیں گے مگر گن گن کر
وہ نہ مانیں گے تو تکرار کریں گے جاکر
پہلوئے یار سے ہرگز نہ اٹھیں گے انجم
عہدِ پختہ ہے جو اس بار کریں گے جاکر

*

شہید عبدالمالک کے آخری الفاظ

قافلے والو چلو آگے بڑھو آگے بڑھو
مستقر اپنا بہت دُور نہیں ہے یارو

ہم تو جانباز تھے، تھا اپنا ہراول دستہ
ہم اگر خاک میں غلطاں ہیں تو اس کا کیا غم
جسم سے خون کا فوارہ اگر چھُوٹا ہے
کشتِ صحرا کو تھی اس تخم رواں کی حاجت
خُون رک جائے تو پیوندِ زمین کر دیجے
لالۂ و گل کبھی اس خاک سے پیدا ہونگے

کارواں میں ہیں ابھی اور جواں سال بہت
تیز پا، سخت قدم، عزم مصمم والے
خاک اڑاتے ہوئے اس راہ سے جب وہ گزریں
استخواں اپنی غبارِ رہِ منزل بن کر
بڑھنے والوں کے نقوشِ کفِ پا چومیں گی

آنے والوں کے لیے ہم تو یہی چاہیں گے
ہم پہ جو گزری ہے وہ کاش نہ ان پہ بیتے

*

موجودہ سیاست

بوجھ بنے بیٹھے ہیں ہل پر
لعنت ہو ان اہلِ دول پر

بُت کدۂ مغرب کے پجاری
ایماں مارکس پر اور ہیگل پر

دِل تو رہینِ حورِ عجم ہے
آنکھ سلیمیٰ کے آنچل پر

ہم بھی سَر کٹوانے پہنچے
بھیڑ تھی افرنگی مقتل پر

ریچھ سے بھڑ وائے گا مداری
مُٹھی بھر گندم کے بل پر

شیخ و برھمن لڑتے رہیں گے
آبِ زمزم ، گنگا جل پر

✱

۳ ر دسمبر ۱۹۷۱ء

مجاہدوں پہ پھر اللہ کے کرم ہونگے
دیارِ ہند میں اب جلد ہی قدم ہونگے

چلو کہ واگھے کے اس پار کا بلاوا ہے
بس اب تو دہلی پہنچ کے ہی تازہ دم ہونگے

خوشا کہ زندہ ہیں تاریخ ساز عہد میں ہم
نئے نقوش زمانے پہ مرتسم ہونگے

کریں گے تازہ روایت حنین و بدر کی ہم
بس اب عدو ہے کوئی اور، اور ہم ہونگے

برہمنوں نے بنائے ہیں اسلحہ خانے
جو گرز غزنوی کے سامنے صنم ہونگے

گھمنڈ جن کو ہے کچھ اپنے خود و آہن کا
وہ جل کے اپنی چتا میں ہی خود بھسم ہونگے

لکھیں گے خون سے خود اپنی موت کے احکام
جو ہاتھ اٹھیں گے اپنی طرف قلم ہونگے

یہ زادگانِ برہمن مثالِ روباہاں
وغا میں معنیٔ و تعبیرِ لفظِ رم ہونگے

نیام سے جو نکل آئی غازیوں کی تیغ
تو جتنے سامنے آئیں گے اتنے کم ہونگے

تفنگِ مردِ مسلمان ہے نعرۂ تکبیر
صدا یہ گونجی تو سر دشمنوں کے خم ہونگے

*

کوئی ہم کو بھی سمجھائے

ہر اک کے لب پہ ہے یہ کیوں ہوا کیسے ہوا آخر
کوئی ہم کو بھی سمجھائے بھلا یہ کس کی سازش تھی!

٭

سفینے کونسے پہنچے تھے بنگالہ کے ساحل پر؟
کُتَرے پر قلینچ کس نے اپنے پیارے شاہبازوں کے؟
فضا میں کرگس وزاغ و زغن کو کس نے دعوت دی؟
لگائی آگ کس صیاد نے سلہٹ کے باغوں میں؟
ہوئیں مسدود راہیں کس طرح چٹگاؤں کھُلنا کی؟
محمد پور کی بستی، میرپور اُجڑے تو کیوں اجڑے؟
سمٹ کیوں آئے دھارے پدما ندی بوڑھی گنگا کے؟
وہ آخر کونسا اپنی صفوں میں میر جعفر تھا
سراج الدولہ کو اک بار پھر جس نے دغا دی ہے؟
یہ کیوں پھیلی اگر سازش اٹھی تھی چوہا ڈنگا سے؟

٭

ترنگا کس طرح لہرایا ہے پلٹن کے میداں میں ؟

*

جو کل تک محتسب تھے اب پس دیوارِ زنداں کیوں ؟
وہ آخر کون تھا شمس و بدر کو جس نے گہنایا ؟
کفن باندھے سروں سے شیر جو نکلے کچھاروں سے
وہ اِک لحظہ میں پابندِ سلاسل ہو گئے کیسے ؟
وہ مکتی باہنی کی ظلمتوں میں چھپ گئے کیسے ؟
جو تیغیں باہر آئی تھیں نیاموں میں ہوئیں واپس
جو تھپڑ مارنے کو ہاتھ اُٹھے پوری قوّت سے
اِنہی ہاتھوں نے کیسے اپنے دشمن کو سلامی دی ؟
یہ تذلیلِ جوانانِ وطن منظور تھی کس کو ؟

*

ابھی تو زخم تازہ تھا ہمیں بیت المقدس کا
در و دیوار ہیں اب نوحہ زن بیت المکرم کے
کوئی ہم کو بھی سمجھائے یہ آخر کس کی سازش تھی ؟

*

تجزیہ

کچھ ایسا سلسلہ یہ چلا غتر بود کا

ڈھاکے میں اب بُلند ہے پرچم ہنود کا

اسلام کا جو کعبۂ اوّل تھا دوستو

اُس سرزمیں پہ اب ہے تصرف یہود کا

عیسیٰ کدھر ہے مہدیؑ موعود ہے کہاں

اب وقت آگیا ہے کسی کے ورُود کا

بازار خوُب گرم ہے رقص و سرود کا

اک دور آچکا ہے سراسر جمود کا

سوزِ یقیں سے جرأتِ ایماں سے تہی

اب دین نام بس ہے سلام و درُود کا

ایسے ہی لوگ برسرِ منبر ہیں وعظ خواں

شک جن کو ہوگیا ہے خُدا کے وجود کا

میداں سے لوٹ آئے ہیں جو اہلِ تیغ تھے
اہلِ قلم کو غم ہے فقط ہست و بود کا

انجم کرو محاسبہ اپنی شکست کا
شکوہ عبث ہے گردشِ چرخِ کبود کا

*

آزاد نظمیں

اِلتجا

خیال و اظہار ایک عالم، یہ جسم اور رُوح ایک دُنیا
یہ کون حائل ہے فاصلوں کی خلیج کیوں ہے!
مری انا میں تری انا میں تضاد کیوں ہے!

تری جُدائی کا غم رتہ دل سے ایک آتش فشاں کے لاوے کی شکل پھُوٹا
جو آہ بن کے جو اشک بن کے فضا میں تحلیل ہو گیا ہے
مگر میں کیسے تجھے بتاؤں
وہ خشک و نم، سرد و گرم، آب و ہوا کی آویزشِ مسلسل
وہ اشکِ سوزاں، وہ سرد آہیں
مرے غم جانگسل کی عکاس تھیں مگر میرا غم نہیں تھیں
وہ تیری آمد سے اِک کرن روشنی کی آنکھوں کی پتلیوں میں جو موجزن تھی
وہ ایک لرزش کہ تھی لبوں پر جو مسکراہٹ سی بن گئی تھی
مسرتوں کی وہ تھی علامت مگر وہ میری خوشی نہیں تھی

وہ ایک احساس قربِ محبوب، وہ رقیبِ مدام، تجھ سے قریب تر تھا

تو پاس آیا تو پاس رہ کے بھی دُور کیوں تھا!

مرے ترے درمیاں کبھی جسم کی کبھی رُوح کی حدیں ہیں

حدیں گرا کر مجھے حقیقت سے ہمکناری کا دے شرف تو

وہ چشم دے جو تجھے نہ دیکھے تری تجلی کی خود ہو مظہر

وہ نطق دے جو ترے خیالات کی زباں ہو

خیال دے جس کا حسنِ عریاں ہو بے نیازِ قبائے معنی

مجھے علامات کے تشدّد سے، استعاروں کی سرد مہری، مجازِ مرسل کے واسطے

سے رہائی دے دے

مجھے توسط کی اور وسیلوں کی کیا ضرورت

قریب آ تو بس ایسے آ کہ میں اپنی میں سے رہائی پاؤں

تجھے جو دیکھوں تو خود کو دیکھوں جو خود کو دیکھوں تو تجھ کو پاؤں

وہ بُعد جو میرے تیرے مابین ہے مٹا دے

*

فیضی کا گیت

ننھے فیضی تیرے لبوں پر گیت ہے کیسا
اپنی تان میں گم تو آخر اتنا کیوں ہے؟
ابّا کے ہاتھوں میں مٹھائی بھول گئی کیا
تابندہ نے تیری گیند کہاں رکھ دی تھی
تجھ کو کچھ بھی یاد نہیں کیا؟

•

تیرے گیت میں لفظ نہیں مفہوم نہیں
اور اگر کچھ ہے تو ہمارے فہم سے بالا
تو گاتا ہے تو اس عالمِ رنگ بو سے
تیرا تخیل تجھ کو عرش پہ لے جاتا ہے
تو یزداں کے ساتھ ہے، تیری معصومی
خود یزدانی کیفیت ہے

*

انگریز بچّہ

ایک ماں کی گود میں ننھا سا بچہ دیکھ کر
ذہن وقت اور فاصلے پر فتح پا کر
اجنبی راہوں سے پھر ان آشنا کوچوں میں مجھ کو لے گیا
وہ حسیں گلیاں جہاں فیضی عجب انداز میں
موتیے کے پھول چنتا تھا

*

مَیں نے اپنے تختِ دل کا تجھ میں پایا تھا نشاں
تو نے کیا دیکھا تھا مجھ میں
کیوں ہمک کر تو نے چاہا تھا کہ میرے پاس آئے
میرا جی چاہا تھا تجھ کو چوم لوں
تجھ کو اپنے جسم سے لپٹا کے دل کی دھڑکنیں
تیری ننھی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ کروں

پھر خیال آیا یہ کب ممکن ہے ایسا ہو سکے
رنگ و نسل و قومیت کے فاصلے
ایک لمحے میں کہاں مٹ جائیں گے

ننھّے بچے تیری معصومی فرشتوں کا لباس
تیرا روحانی تقدس تیرے طفلانہ تبسم سے عیاں
رنگ و نسل و قومیّت سے ماورا ہے
وائے یہ معصومیّت انسان کی قسمت نہیں
تو اگر چاہے تو میرے پاس آسکتا نہیں
میں اگر چاہوں تو تجھ کو پیار کر سکتا نہیں
رنگ و نسل و قومیّت کے فاصلے
آدمی کو آدمی سے کس قدر بیگانہ کرتے آئے ہیں
بیگانہ کرتے جائیں گے

مطلعہ

شمع کی مدہم سی لو پر چند پروانوں کا رقص
اور مٹیالی سی دیواروں پہ لرزاں ہلکی ہلکی روشنی
اپنا سایہ دیکھ کر وحشت ہوئی ———
جسم لاغر قوس کے مانند خم کھاتا ہوا
گوشش و بینی کے میاں اِک دائرہ
چند سالوں سے مری کمزور آنکھوں کا رفیق
اپنا سایہ دیکھ کر وحشت ہوئی حسرت ہوئی ———

کونسا جذبہ تھا جس سے بھاگ کر
چشم و ابرو، جذب و مستی، شہرِ خوباں چھوڑ کر
علم کی ویرانگاہوں میں سراسیمہ پھرا
اختیار و جبر، خیر و شر کی آویزش کی ساری گتھیاں

کس سے سُلجھی ہیں جو ناحق اُن کو سُلجھاتا رہا
اب ہوا احساس اپنی عمر کو ضائع کیا، ضائع کیا
زندگی کا اپنے بنیادی حقائق سے فرار
دیر تک ممکن نہیں، ممکن نہیں ——

مدتیں گذریں کہ دل کو دفن کر آیا تھا میں
آج اُس سائے میں پھر اُس کو دھڑکتا دیکھ کر
رُوح کانپی، ذہن نے کروٹ بدل کر
طاقِ ماضی سے حکایاتِ جنوں کی گرد آلودہ کتاب
مدتوں کے بعد اٹھا کر صفحۂ اوّل سے تا آخر پڑھی
"مَیں وہی ہوں؟" —— مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا
"وہی ہوں جو کہ تھا" سائے نے اپنی پشت کو سیدھا کیا
علم و دانش کا خزینہ، فلسفہ کی پھیکی پھیکی بدمزہ، بے رنگ بوسیدہ کتاب
میز سے یکدم گری
چند پروانے جو گردِ شمع رقصاں تھے اڑے
اور پھر اپنے ہی لمحے شمع کی مدہم سی لَو کے گرد رقصاں ہو گئے

طالب علم کی خود کلامی

کچھ نہیں آتا سمجھ میں کیا کروں
پھانس وہ اٹکی ہے دل میں جو نکلتی ہی نہیں
ناخنِ تدبیر بھی تھک ہار کر شل ہو گئے
ایک اکتاہٹ رگ و پے میں ہے یوں ٹھہری ہوئی
جیسے پیمانے کی تہ میں گدلی گدلی تلچھٹیں
خواب و بیداری میں خورد و نوش میں صبح و مسا
اِک تسلسل ایک یکرنگی ہوئی دل پہ محیط
ذہن پر چھایا ہوا ہے اک تعطل، اک جمود
دلدلوں میں پھنس گیا ہوں

اب کتابوں میں بھی جی لگتا نہیں
دل میں یہ آتا ہے کوئی معرکہ انجام دوں

غازیانِ صف شکن کی طرح میداں میں بڑھوں
دشمنانِ مُلک و ملّت کو تہ و بالا کروں
موت کے لمحوں میں جا ڈھونڈوں سراغِ زندگی ——

توسنِ عزمِ جواں دوڑا رہا ہوں ہر طرف
ہر طرف اِک جنگ کا میدان میّسر ہے مجھے
کوئی بھی دشمن مگر آتا نہیں مجھ کو نظر
جھانکتا ہوں دل میں تو خود کو عدو پاتا ہوں میں
اپنا خنجر اپنے سینے میں چبھو دوں کس طرح
وار میں خود آپ اپنی ذات پر کیسے کروں ؟

*

ذہن میں اِک کشمکش ہے قلب میں اِک اضطراب
سوچ کی پُر پیچ گلیوں میں ہوں مَیں کھویا ہوا
کوئی بھی ملتی نہیں راہِ عمل ، راہِ فرار
کس طرف جاؤں کدھر کا رُخ کروں ؟

دلِ خزف ریزوں پہ مائل ہے ہٹاؤں کس طرح ؟
لولؤ و مرجانِ فردا کی کروں خواہش تو کیوں ؟
کل کی خاطر آج کے دُکھ سہہ تو لوں گر ہو یقین
پر یقین مجھ کو نہیں

ذہن میں لاوا اُبلتا ہے میں کچھ کہتا نہیں
رُوح کی وادی میں چیخیں درد کی سنتا ہوں میں
جامد و ساکت کھڑا ہوں اک جوالا کی طرح
کب تلک میں آپ اپنی آگ میں جلتا رہوں ؟

*

منزلیں ہر سو ہیں پر اپنے قدم اُٹھتے ہیں
محوِ حیرت ہوں کدھر ڈالوں نگاہِ انتخاب
مقصدِ ہستی کی گتھی کا سلجھنا ہے محال
سوچتا ہوں جامۂ ہستی کو کر دوں تار تار

میں سرائے زندگانی میں کروں کب تک قیام؟
آخرش جانا ہے گھر، لیکن وہ گھر ہے یا نہیں؟
بن بلائے کیسے اپنے گھر چلوں

آسماں سے کاش ٹوٹیں کڑکڑاتی بجلیاں
ایک چشمک میں مری ہستی کو خاکستر کریں
خواہشِ تعمیر کی تکمیل گر ہوتی نہیں
پھر یہی بہتر ہے کچھ تخریب کا امکاں تو ہو
اب مری برداشت سے باہر ہے کربِ زندگی
اب تو کچھ ہو جائے، چاہے کچھ بھی ہو

گھاؤ

پراں پراں ہر لمحے کے بال و پر
رُوح کے تاروں سے چھو چھو کر
راگ عجیب الاپتے ہیں

میں سنتا ہوں، سنتا ہوں اور سوچتا ہوں
سوچ بھی وہ جو ٹوٹی ٹوٹی بکھری بکھری پارہ پارہ
لمحے لمحے کے بازو پر اڑتی اڑتی
بنتی اور بگڑتی ہے

جیسے زخمی اڑتی کونجوں کی اک گرتی ہوئی قطار
دور فضا میں چیخوں کی اک آگ کو پھیلاتی جائے
جیسے دف کی ضرب پہ نخلستانوں میں بسمل کا رقص

جیسے گرد کسی وحشی دشمن کے قبیلے کا سردار
حوروشوں کے جھرمٹ میں یخ بستہ نبیذ کا جام پیئے
اور بسمل جلاد کی تیغِ عریاں سے تھر تھر کانپے
اور پھر موت کا رقص کرے

*

ایسے ہی ہم زخمی کونجیں ہیں اور وقت کے باز و پر
ان جانی ان دیکھی منزل کی جانب
چیخیں مارتے طوعاً کرہاً افتاں خیزاں دوڑتے ہیں

ہم وہی بسمل ہیں جو نخلستانوں میں
حوروشوں کے جھرمٹ میں
چشمکِ تیغ براں کے دم تک ہستی کے جام کی تلچھٹ چاٹتے ہیں

*

زخمی رُوح ، بدن زخمی ہے
میں زخمی ہوں ، دل زخمی ہے ہم سب وقت کے زخمی ہیں
زخم ہی زیست کا حاصل ہیں

*

حادثہ

مسرتوں کی جستجو صراطِ مستقیم سے ہٹا کے لائی کس طرف
یہ محض اتفاق تھا کہ سوئے اتفاق تھا
سفینہ اپنے ساحلوں سے دُور اجنبی سمندروں میں غرق ہوگیا
تھی مجھے طلب مگر تری نہ تھی
تھی تجھے طلب مگر مری نہ تھی
بس اک نگاہ نے ہماری مشترک ضرورتوں کا عہد نامۂ عتیق
لب و زبان و عارض و جبین و چشم و زُلف پر
بصورتِ قدیم و آشنا نقوشِ مصحفِ ازل رقم کیا
اگر تھی جنتِ بدن فریب
تو رُوح دور دوزخوں میں مبتلائے کرب و ابتلا
یہ کہہ رہی تھی چیخ چیخ کر یہاں سے بھاگ چل
مرے حواس میرے اختیار میں مگر نہ تھے

زباں گنگ، کان بند، آنکھ تیرگی میں گم
اِک ایسی کشمکش تھی میں گڑھے میں لڑکھڑا کے گر پڑا
مرے ہی خوں کا جوش تھا مرے ہی خوں کا گرم گرم ذائقہ
جو تیرے واسطے سے مجھ کو مل گیا
مجھے بتا کہ تُو نے مجھ کو کیا دیا
بس ایک آئینہ ضمیر کا کہ جس پہ کوئی غیر شکل منعکس نہ ہو سکی
وہ آج اس عجیب حادثے میں چور ہو گیا

*

ایک پرانا شہر

(۱)

لامکاں اور مکاں کے مابین
سرحدیں خواب و حقیقت کی جہاں ملتی ہیں
وقت کا نقطۂ آغاز جہاں ہے قائم
اِک وہاں شہر کبھی بستا تھا
شہر کے وسط میں اِک باغ میں تھی آبِ رواں کی اِک نہر
قافلے جس کے کناروں پہ رُکا کرتے تھے
کارواں رُوحوں کی عریانی کا معصوم لبادہ اوڑھے
روز و شب آبِ مصفا میں جہاں غسل کیا کرتے تھے
جوق در جوق جہاں لوگ بلوغت کی سڑک سے ہوکر
بہرِ تن پوشی اسی شہر کے بازار کا رُخ کرتے تھے
ٹاٹ کھدر کے لئے کوئی، کوئی بوریا یا گاڑھا پہننے کے لیے

زیبِ تن کرنے کو کچھ مخمل و کمخواب و حریر، اطلس و زربفت کے چمکیلے
ملائم جامے

(۲)

میں بھی اُس شہر میں اک دن آیا
کتنے بارونق و گنجاں تھے وہاں کے بازار
کونسی شے تھی نہ تھی جو ارزاں
کونسی چیز تھی جس کا کہ خریدار نہ تھا
کوچۂ حُسن میں تھے عارض و چشم و ابرو
مذبحِ عشق میں تھا خونِ تمنا ہر سو
سوقِ عشرت کا ملمع، دمِ شہرت، حشمت
اور مے خانوں میں ڈھلتی مئے عیشِ امروز
ایک دو جنس گراں مایہ مگر تھی نایاب
ہاں دلِ زندہ نہ تھا اور نہ چشمِ بینا

(۳)

مرے ساتھی رہے مصروف خریداری میں
میں بھی بازار میں گھوما کیا لیکن بے سود

میرا مطلوب مرا دیدۂ بینا نہ ملا

آخرش میں نے بھی دکانِ ازل سے جاکر
نقدِ اخلاص ادا کر کے خریدی اِک شے
یہ تھی جنسِ غمِ ہستی کہ جسے کوئی نہیں پوچھتا تھا
اسی گٹھڑی کو بصد شوق اُٹھایا میں نے
کبھی سر پر اسے لادا کبھی کاندھوں پہ رکھا
یہی حاصل تھا تجارت کا یہی رختِ سفر تھا میرا

(۴)

ظلمت و نور میں یہ قافلہ چلتا ہی رہا
کام کرتے رہے دز دانِ سبک دست بھی ساتھ
راہبر بن کے سبک پا گئی رہزن آئے
چشم و عارض کی تر و تازگی لینے کبھی تاتاری ایام آیا
درد کے گھاؤ کا منہ باندھ گیا گاہے سمے کا ہندو
نشۂ عیشِ شبِ وصل خمارِ غمِ فرقت میں ڈھلا
شہرت و حشمت و جاہ، سب کا ملمع اترا
جو تونگر تھے تہی داماں ہوئے وقت کے ہاتھ

مَیں کہ آغاز میں دلدادۂ افلاس تھا مفلس ہی رہا
ہاں وہ اِک گٹھڑی جو تھی میری متاعِ اخلاص
جِسے دُکان ازل سے تھا خریدا مَیں نے
میرے سر، کاندھوں کی، اور پشت کی دائم ساتھی
حرزِ جاں بن کے رہی
کسی رہزن نے کسی دزد نے بھُولے سے نہ اُس کو چھیڑا

(۵)

کتنی تیزی سے مہ و سال گزر جاتے ہیں
توسنِ عمرِ رواں آج عجب وادی میں لے آیا ہے
بھیگی بھیگی جہاں شامیں ہیں جوانی کی کڑی دھوپ کے بعد
خضر و الیاس کے ساتھی کی سکونت ہے جہاں ———
ایک اِک کر کے چھُٹے راہ میں سارے ساتھی
آنکھیں دھندلا سی گئیں گوشِ سماعت سے ہوئے بے بہرہ
ضعف سے نطق کا یارا نہ رہا
تھکے اعضا نے کہا آؤ پڑاؤ کر لو
آمدِ شب سے ذرا پہلے کہیں سستا لو

میرے ہاتھوں میں رہا میرا عصائے پیری
جو بندھاتا رہا ہمت ہر دم
مجھے اکساتا رہا آگے بڑھو، آگے بڑھو
جستجو جس کی تمہیں کھینچ کے لائی ہے یہاں
کیا خبر وہ اسی منزل میں کہیں پاس ہی ہو

(۶)

پھر اچانک کہیں اِک زور کی بجلی کوندی
کس چوٹی پہ تجلی کا الاؤ دہکا
تیرگی میں ہوئی اک لحظے کو روشن یہ اُفق پر تحریر
"چشمِ بینا کے طلب گار ۔ اے حمالِ غمِ دہر ٹھہر
اپنی گٹھڑی کو ذرا کھول کے مطلوب ترا
عمر کے نقطۂ آغاز سے تاحال ترے پاس ہی تھا"

(۷)

قیمتی وقت کے کھو جانے کا احساس دلانے کے لیے
کیسی تحریر تھی جو بجھ کے بھی روشن ہی رہی
اب نہ وہ باغ نہ وہ نہر نہ وہ آب رواں

اب وہ بازار نہیں

اب نہ سانسوں کی حرارت ہے نہ وہ عزمِ جواں
اب نہ جذبہ ہے سیاحت کا نہ وہ شوقِ سفر
اِک بُرودت کا ہے احساس کہ جاں لیوا ہے
میں تھکا ہارا ہوں اب بیٹھ گیا ہوں اِک سمت
ہاں وہی اِک دلِ زندہ وہی چشمِ بینا
شہرِ ہستی میں جو تھی جنسِ گراں مایہ کبھی
آخری وقت میں جس کا مجھے ادراک ہوا
کاش بتلائے کوئی اس کو کہاں لے جاؤں

*

کشفِ حقیقت

جستجو کس کی مجھے آج یہاں لے آئی
وہی گلیاں وہی کوچے وہی لوگوں کا ہجوم
ادھ مٹے نقش لیے گرتی ہوئی دیواریں
کہنہ حجروں میں اگرچہ نئے چہرے دیکھے
مسجد و منبر و محراب وہی ہیں لیکن
پنجگانہ وہی آواز ابھی آتی ہے
جس پہ لبیک کبھی کہنے کی فرصت نہ ملی

*

میں سراسیمہ پریشاں سا کھڑا ہوں اِک سُو
مدتوں بعد انہی گلیوں میں کیوں آنکلا
دوپہر جب تجی جوانی کی تو گھر سے باہر
گھومتا تھا میں کڑی دھوپ میں صحرا صحرا

اب سرِ شام ٹھٹھرتا ہوا خنکی کے سبب
وقت کی برف لیے سر پہ چلا آیا ہوں

سوچتا ہوں میں کبھی کیا تھا—— بنا ہوں اب کیا
اپنی ہستی کا تشخص بھی کروں تو کیونکر
عمر گذری یہیں کچھ کھویا تھا کچھ پانے کو
اب میں گذرے ہوتے ایام میں کیا کیا ڈھونڈوں

جسم اور ذہن ہیں اڑتے ہوئے لمحوں کے اسیر
وقت کے ساتھ نئے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں
نہ بدلتے ہوئے ہر لحظہ بدل جاتے ہیں
ہاں فقط ایک تسلسل جو نظر آیا کہیں
وہ تری دید کی اِک خواہش طفلانہ ہی تھی
جستجو تیری تھی جو آج یہاں لے آئی

تو وہ خوشبو کہ مہک جس کی مشامِ جاں میں
عمر کے ساتھ چلی آج تلک تازہ رہی
تو وہ نغمہ بھی کہ لَے جس کی تھی ایسی دلسوز

خرمنِ قلب سے ہر لحظہ دھواں اٹھتا رہا
چشمکِ برقِ تجلی کا وہ نظارہ رہی
دیدۂ شوق ہوا کوندے سے جس کی خیرہ
وہ ترے جسمِ خیالی کا اک احساس تپاں
موجزن تھا رگ و ریشے میں حرارت بن کر
ایک لے ، ایک مہک ، ایک تپش ، ایک منظر
میری ہستی کا یہ سرمایہ مجھے کافی تھا
پھر مَیں کیوں تیرے گلی کوچوں میں آنکلا ہوں
جستجو کس کی مجھے آج یہاں لائی ہے

آج اِک لحظہ تجھے دیکھا تو احساس ہوا
تو بھی میری ہی طرح وقت کی قیدی نکلی
عرصۂ زیست میں تنہا تو نہ تھی تو لیکن
تجھ پہ بھی لشکرِ غم نے کئی شب خوں مارے
آہ وہ جنتِ گم گشتۂ دامانِ خیال
وہ ترے کوچے میں بھی مجھ کو کہیں مل نہ سکی

ہاں مگر ایک حقیقت کا ہوا کشف مجھے

اب ہے خوابوں کے جزیروں کا سفر لاحاصل
اک چھناکا ہوا سینے میں کوئی شے ٹوٹی
اک دھماکا ہوا اور ٹوٹ پڑے لات و منات
میری تخیّل نے جو نقش حسیں کھینچا تھا
وہ حقیقت سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہی سہی
لیکن اصنامِ خیالی تو خدا ہوتے نہیں

میں سراسیمہ پریشاں سا کھڑا ہوں اِک سو
رات آنے کو ہے اب ہوگا بسیرا تو کہاں
کتنا بروقت پکارا ہے موذن نے مجھے
اب قدم مسجد و محراب کی جانب ہیں رواں

زندگی اور موت

زندگی مستقل موت ہے
لحظہ لحظہ نئے تجربے کا ہے خالق
مگر تجربہ لحظے لحظے کی مانند
اک دوسرے سے جُدا
کتابِ دریدہ کے اوراق کی طرح بکھرا پڑا ہے

ہر اک تجربہ اپنی ہستی سے ہے گرچہ صُورت پذیر
مگر ہم بھی کیا ہیں!
پرِ کاہ جو جھاگ اڑاتے ہوئے سیلِ ہستی پہ بہتے چلے جارہے ہیں
نہ رُخ کا تعیّن نہ احساسِ منزل
بس اک سایۂ مرگ ہے ہر قدم پہ جو پیچھے لگا ہے

خُدا جانے یہ سایہ کب ہم پہ جھپٹے ہمیں ظلمتوں میں گھسیٹے
ہماری کتابِ دریدہ کے اوراق کو نذرِ آتش کرے
ہمیں وقت کی قید سے دے رہائی
ہمیں اُس عدم کی طرف لے بڑھے
نہ لحظے جہاں کچھ ہیں نئے تجربے ہیں
جہاں موت معدوم ہے
جہاں زندگی منتقل زندگی ہے

*

آخری وقت

نہ تو قدموں کی کوئی چاپ نہ آہٹ کوئی
پاس بیٹھے ہوئے یاروں کے نہ ابرو اُٹھے
کیسے چپ چاپ خموشی سے عیادت کے لیے آیا ہے
اس سے پہلے تو کبھی اس سے شناسائی نہ تھی
اس سے انجانا سا کیوں خوف سا محسوس مجھے ہوتا ہے
اسے مت آنے دو

*

میرے حلقوم سے آواز نکلتی ہی نہیں
نطق پر کیسے پڑے ہیں تالے
میری آنکھوں پہ مسلط ہے جو وحشت کا اثر
اُس سے آگاہ نہیں ہے کوئی
سنسناہٹ سی کفِ پا میں جو موجود تھی اب وہ بھی نہیں

اب کہاں تاب کہ انگشت سے یا جنبشِ ابرو کے اشارے سے کہوں

اسے روکو اسے مت آنے دو

*

بند کمرے میں کہاں سے یہ گھر آتے بادل

اڑتے پھرتے ہیں ہر اک سمت رُوئی کے گالے

چشمِ وا روزنِ بے نور ہوئی جاتی ہے

اس دریچے سے نہ پھُوٹے گی شعاعِ اُمید

اب اس آئینے میں تصویر نہیں اُبھرے گی

دھندلے دھندلے سے ہوئے جاتے ہیں سارے چہرے

پاس بیٹھے ہیں مگر دُور بہت دُور ہوئے جاتے ہیں

آخری وقت مجھے ایسے نہ تنہا چھوڑو

میری پیشانی پہ جھکنے والو

اجنبی ساتھی کہاں مجھ کو لیے جاتا ہے

برف ہی برف ہے تا حدِ نظر برف ہی برف

اُجلے اُجلے سے پہاڑوں کا کوئی خطۂ ہیبت آگیں

غار ہی غار ہیں منہ کھولے گرسنہ ہر سو
تنگ تاریک عمیق
منجمد سا ہوا جاتا ہے ہر اک ریشۂ جسم
مجھے احساس نہیں ہے کہ میں ہوں بھی کہ نہیں
ہوں بھی کہ نہیں

*

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد

زندگی کا تموّج نہ جانے کہاں کھو گیا
مضمحل ہیں قویٰ، شل ہوا ہے بدن
نطق و احساس میں رابطہ کٹ گیا
منجمد خواہشیں منجمد حسرتیں
کون احساس کی برف پگھلائے گا!

*

میرے جذبات کے گہرے پانی کے ٹھہراؤ میں
سرد رو، گرم رو، جذب ہو کے رہیں
کتنے طوفان تھے جو دبے رہ گئے
برف کی تہ میں گویا جوالا مکھی سو گیا
کونسا شاہِ خاور حرارت کی کرنوں کو برسائے گا!

*

رُخ نمائی کی خواہش لیے تھی عروسِ حیات
ایک کونے میں گٹھڑی کے مانند سمٹی ہوئی

اپنے گھونگٹ میں محبوس بوڑھی ہوئی
اس کے چہرے کی شکنوں کو دیکھے گا کون
کون بانکا جواں آ کے آئینہ دکھلائے گا!

✱

کوئی بجلی گرے کوئی شعلہ اُٹھے
صُور پھونکے کوئی، حشر برپا کرے
حدتِ شعلۂ عارضِ آرزو
دے سکے گر تو دے زندگانی کا لمس
کون اب سرد پہلو کو گرمائے گا!

✱

زندگی آرزو کی فقط ایک دن ہی تو ہے
صبحِ تاباں گئی روزِ روشن گیا
چہرہ سہ پہر کا اپنے سائے کی زلفوں میں چھپتا گیا
رات تاروں کی چُنری پہن کر نمودار بھی ہو گئی
میں ابھی منتظر ہوں کوئی آئے گا آئے گا آئے گا
جانے کب آئے گا؟

چالیسویں سالگرہ

سنہرے دن اور روپہلی راتیں
کہ وقت کے بحرِ بیکراں میں اتر گئی ہیں
کہاں گئی ہیں
میں ڈھونڈتا ہوں کدھر گیا ہے
وہ بانکپن وہ شباب اپنا
وہ منزلیں کس جگہ چھپی ہیں
جہاں تھا پُر غیظ، تند اور تیز سیلِ ہستی
میں سوچتا ہوں کہ چپکے چپکے
یہ کون آیا ہے جس نے سر کی سیاہیٔ شب میں
چاندنی کی سفیدیاں سا بکھیر دی ہیں

*

میں شاہراہِ حیات پر اُس جگہ کھڑا ہوں

جہاں حرا ہے
جہاں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہے آگ روشن
مسافروں کو پیمبری جس جگہ ملی تھی
مجھے یہ احساس ہو رہا ہے
کہ جس جگہ میں پہنچ گیا ہوں وہاں ہر اک نے بقدرِ ہمت
ہزار کھونے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ تو پایا
مگر میں محرومیوں کے تیروں کا زخم خوردہ
سنہرے دن اور روپہلی راتوں کو ڈھونڈتا ہوں

سنہرے دن اور روپہلی راتوں کی حسرتوں کو جگانے والا
یہ میرا ہمزاد تو نہیں ہے
یہ میرا ہمزادِ چہل سالہ جو آج بیدار ہو گیا ہے
جو لذتوں سے کنارہ کرنے پہ طعنہ زن ہے
جو کہہ رہا ہے ستم ہوا ہے غضب ہوا ہے
کہ زندگی رائیگاں گزاری

میں جانتا ہوں کہ اپنی تخلیق میں ہے مضمر فنا کا عنصر
بہت ہی باریک اور نازک
حیات اک تارِ عنکبوت اور موت گویا فنا کا جھونکا
کسے خبر کب ہوا چلے کب یہ تار ٹوٹے
کسے خبر کب یہ خفتہ ہمزاد جاگ اٹھے
کسے خبر کب یہ راہزن کارواں کو لُوٹے

*

میں چاہتا ہوں کہ اپنے ہمزاد کو سلا دوں
میں چاہتا ہوں کہ جن مواقع کو بحرِ ماضی میں غرق کر کے میں مطمئن تھا
وہ پھر نہ اُبھریں
میں جانتا ہوں سنہرے دن اور روپہلی راتوں کی حسرتوں میں تباہیاں ہیں
مگر یہ خدشہ ہے دل کو لاحق
کہیں نہ ہو جاؤں اپنے ہمزاد ہی کے ہاتھوں خراب و رسوا
کہیں بھرم زہدِ چہل سالہ کا ٹوٹ جائے نہ لمحہ بھر میں
کہ اِس مقامِ پیمبری پر
ہزاروں شیطان سر اٹھائے ہر اک مسافر کی تاک میں ہیں

بادۂ مستعار

فصل کی کٹائی

میں تھک گیا ہوں
مری درانتی کی نوک مٹی میں پھنس گئی ہے
مرے مقدر میں جتنی فصلیں تھیں کاٹ لی ہیں
بس ایک دو کرم فصل باقی کھڑی ہے لیکن
مری درانتی کی نوک مٹی میں پھنس گئی ہے

مری کلائی میں میرے بازو میں کسمساہٹ سی ہو رہی ہے
کہ جیسے خون رک گیا ہو اپنا
مری خمیدہ کمر میں اب تاب ہی نہیں ہے
میں تھک گیا ہوں

میں سو گیا ہوں کہ جاگتا ہوں
کہ آج ماضی کی ساری فصلوں کی خوشبوئیں ہیں مشامِ جاں میں
جوار، گیہوں، مکئی، چنا، باجرہ، مٹر، موٹھ، ماش، سرسوں
وہ ساری فصلیں کہاں گئی ہیں
وہ دن بھی کیا دن تھے ہل چلاتے تھے، بیج بوتے تھے
فصل کا انتظار کرتے تھے، فصل اگتی تھی کاٹتے تھے
کبھی توقع سے بڑھ کے محنت کا اجر پایا
کبھی ہوا، آگ، خاک، پانی کی رہزنی کا ستم اٹھایا
ہمیشہ جب لہلہاتی فصلوں کے کاٹنے کا زمانہ آیا
تو سب حریفوں کو میں نے للکار کر پکارا "بڑھو جوانو
ہم آج دیکھیں کہ کون میدان مارتا ہے!"
نہ آج تک کوئی آگے آیا
مری درانتی ہی آج لیکن کچھ اس طرح آگے آگئی ہے
اگر میں چاہوں تو اس کو مٹی کی چیرہ دستی سے ایک دم میں رہائی
دے دوں
مگر میں عزم اور ہچکچاہٹ کے درمیان بے بسی کے عالم میں چپ ہوں بیٹھا

پکی ہوئی فصل کی ہوا میں عجیب خوشبو رچی ہوئی ہے
سنہرے خوشے ہیں خشک شاخیں ہیں اور درانتی کی سرسراہٹ
قریب ہی فصل کٹ رہی ہے
قریب ہی کوئی نوجواں ہے جو ہنس رہا ہے
مرے پپوٹوں پہ نیند کا بوجھ سا ہے آنکھیں بھی مند رہی ہیں
مری درانتی کی نوک مٹی میں پھنس گئی ہے
بس ایک دو کرم فصل باقی کھڑی ہے لیکن
جو کاٹ لی خوب تھی جو باقی رہی وہ باقی بچی رہے گی
میں تھک گیا ہوں

*

رابرٹ فراسٹ کی AFTER APPLE PICKING سے ماخوذ

خزاں کا گیت

سنہرے دن بھی یادوں کی طرح ہیں بجھ ہی جاتے ہیں
جو خوشیاں وہ اڑا لے جائیں پھر ان کی خبر ہو کیا
خزاں کے یہ شجر ویراں بھی جلوے کچھ دکھاتے ہیں

خزاں دیدہ گرے پتے ہوا سے رولے جاتے ہیں
ہر اک شے کی طرح پتوں کا بھی انجام ہے کیسا
سنہرے دن بھی یادوں کی طرح ہیں بجھ ہی جاتے ہیں

طیورِ غم نصیب افسردگی کا گیت گاتے ہیں
چمن کی ہر روش پر بچے بچے کا ہے یہ کہنا
خزاں کے یہ شجر ویراں بھی جلوے کچھ دکھاتے ہیں

پرندے اب سمندر پار ہجرت کرتے جاتے ہیں
دِل مہجور اپنی راہ پر ہے پھر قدم پیما
سنہرے دن بھی یادوں کی طرح ہیں بجھ ہی جاتے ہیں

فضاؤں میں وہی مرغانِ آبی آتے جاتے ہیں
وہ پارینہ تن آسانی پہ کرتے ہیں جو استہزا
خزاں کے یہ شجر ویراں بھی جلوے کچھ دکھاتے ہیں

خزاں کے دن پرانے زخم پر مرہم لگاتے ہیں
خزاں مُسرِف تھی لیکن اب نمونہ ہے وہ خست کا
سنہرے دن اگرچہ ٹمٹما کر بجھ ہی جاتے ہیں
خزاں کے یہ شجر ویراں بھی جلوے کچھ دکھاتے ہیں

*

ڈورتھی براڈنلا کے AUTUMN VILLANELLE کا ترجمہ

پشیمانی

کاش وہ اشک وہ آہیں مجھے واپس مل جائیں
میری آنکھوں میرے سینے میں جو پنہاں تھے کبھی
اب مجھے ان کی طلب ہے کہ ہے فقدانِ سکوں
مَیں نے دُکھ جھیلے ہیں ماضی میں مگر سب بے سُود
جب صنم پوجے تو آنکھوں سے رواں سیل ہوئے
دامنِ دل کو کیا تار غموں نے کیا کیا
مَیں نے جو چاہا تھا کر ڈالا ــــــ یہی میرا عمل
میری تقصیر تھی ۔ اب کتنا پشیماں ہوں مَیں

ہے کوئی رندِ بلانوش کہ دزدِ شب عیش
جو ہوس کار ہے وہ نشۂ پندار میں مست
اپنے ماضی کی حسیں یادوں میں پاتا ہے سکوں

مَیں ہی بد بخت ہوں جس کو کبھی راحت نہ ملی
ہوئی مدّت کہ ہے اِک رنجِ گرانبار، جو ہے
میرے عصیاں کا سبب، میری سزا کا خالق

*

جان ڈون کے تیسرے HOLY SONNET کا ترجمہ

غزلیات

غزل (بطرز قدیم)

کمزور سے کاندھوں پہ اٹھائے نہ بنے ہے
ہے بوجھ وہ ہستی کہ گرائے نہ بنے ہے

نے ضبط کی طاقت ہے نہ اظہار کی جرأت
رو رو کے بھی جی جان گنوائے نہ بنے ہے

گلشن پہ تو اب زاغ و زغن کا ہے تصرف
گلشن میں کسی طور بھی جائے نہ بنے ہے

محفل میں کوئی رنگ جمائے نہ جمے ہے
دل کو کوئی تدبیر سجھائے نہ بنے ہے

جس بات کا ہے کوچہ و بازار میں چرچا
وہ پوچھیں تو پھر بات بنائے نہ بنے ہے

رونے سے بھڑک اُٹھے لگاوٹ ہے عجب آگ
یہ آگ جو بھڑکے تو بجھائے نہ بنے ہے

اب نطق کا یارا لبِ گوتم کو کہاں ہے
اب پاس وہ آئے تو بلائے نہ بنے ہے
ہر صفحۂ سیپارۂ دل پر ہے جو اِبن مریم
وہ نام کسی کو بھی بتائے نہ بنے ہے

*

○

لوگ اٹھتے جا رہے ہیں بیٹھتا جاتا ہے دل
جب بھی کوئی یاد آجاتا ہے بھر آتا ہے دِل

کس قدر ارزاں ہوئی جنسِ محبت ہائے ہائے
اِک نظر کے واسطے میرا لٹا جاتا ہے دِل

کس نے یوں محفل میں آخر نام اس کا لے دیا
بے خبر ہو کے یہ ناداں جھومتا جاتا ہے دل

دے رہی ہیں دعوتِ نظارہ ان کی شوخیاں
اس طرف آنکھیں اٹھانے سے بھی شرماتا ہے دل

حضرتِ انجم تذبذب میں پڑے ہیں خیر ہو
ایک دل ہے اور پھر ہر اک پہ آجاتا ہے دِل

*

○

سنائے کون بھلا کب سنائے جاتے ہیں
رہِ جنوں میں جو صدمے اُٹھائے جاتے ہیں

اُمید و بیم کی دنیا بسائے جاتے ہیں
بنا کے نقشِ محبت مٹائے جاتے ہیں

گزر گئی جو قیامت انہیں وہ کیا معلوم
وہ بے خبر ہیں کہ یوں مسکرائے جاتے ہیں

ہے خارزار بھی اب خونِ پا سے لالہ عذار
جہاں گزر ہو وہیں گل کھلائے جاتے ہیں

جو آگ سینے میں پنہاں تھی آشکار ہوئی
فروغِ اشک سے دامن جلائے جاتے ہیں

وہ انتہائے ستم کر سکیں تو پھر دیکھیں
ابھی سے صبر مرا آزمائے جاتے ہیں

جو بارگاہِ محبت سے دور ہیں انجم
وہ خوش نصیب بھی آخر بلائے جاتے ہیں

*

○

جو بھی اُس کو چاہے وہ لوگوں میں دیوانہ بنے
شرط اگر یہ ہو تو پھر کوئی نہ فرزانہ بنے

حاصلِ تعمیر تو یہ ہے کہ مے خانہ بنے
ہم کو اس سے کیا غرض مسجد کہ بُت خانہ بنے

پھر بہار آئی سوئے صحرا کوئی وحشی گیا
گرمیٔ وحشت سے اب گلشن بھی ویرانہ بنے

راز کی باتیں کہیں اور راز پھر افشا نہ ہو
شکرِ ایزد گفتگو کے طور مستانہ بنے

ہم پہ کیا موقوف غرقِ نشہ ہوں سب اہلِ ہوش
بزم مے میں گر کبھی وہ آنکھ پیمانہ بنے

موسم گل میں کہو لبیک انجمؔ موت کو
یوں کہ اپنی زیست کا ہر لمحہ افسانہ بنے

○

اللہ رے یہ جور بیداد چمن میں
ہے گریہ کناں مرغِ چمن زاد چمن میں

دیکھی جو کبھی صورتِ صیاد چمن میں
آیا ہے اُسی وقت خُدا یاد چمن میں

یارا نہیں گردشت نوردی کا تو اے دست
کس منہ سے کریں شکوہ و فریاد چمن میں

پر قینچ ہیں اور شاخِ نشیمن بہت اونچی
ہاں ٹھیک ہے ہم ہو گئے آزاد چمن میں

غنچوں نے تعجب سے نقاب اپنا کیا چاک
اِک لمحہ جو ٹھہرا وہ پری زاد چمن میں

ان سے نہ مرے زخمِ جگر کی بنی تصویر
گھومے تو بہت مانیؔ و بہزاد چمن بہ

صد زخمِ جگر ساتھ لیے آگیا انجمؔ
اِک اور چمن ہو گیا آباد چمن میں

○

تمہارے در پہ آیا تھا بیانِ حال کی خاطر
مگر تم سے ہوئی نہ مجھ سے خستہ حال کی خاطر

پسِ جود و سخا ذاتی غرض ہی کار فرما ہے
وہ صدقہ کیا دیا جو جائے جان و مال کی خاطر

یہ شبنم کے گہر ہیں اشک گویا لیلیٰ شب کے
امڈ آئے جو شاید سبزۂ پامال کی خاطر

ستم یہ کم تھا جو محفل میں آہیں ہو گئیں باغی
مگر وہ کہ نکلے اشک استیصال کی خاطر

سرِ بالینِ انجم کون آیا ہے ذرا دیکھو
کہ نکلی جائے تن سے رُوح استقبال کی خاطر

*

○

زہرِ غمِ حیات پیئے جا رہا ہوں مَیں
ہے انتظارِ مرگ جیئے جا رہا ہوں مَیں

تا قرضِ زیست سے میں سبکدوش ہو سکوں
ہر سانس قسط ہے کہ دیئے جا رہا ہوں مَیں

پھر اہتمامِ آمدِ فصلِ بہار ہے
دامانِ چاک چاک سیئے جا رہا ہوں مَیں

کیا جبر و اختیار کہ بے اختیار و جبر
تیرا ہی نام ہے کہ لیے جا رہا ہوں مَیں

جینا ترے بغیر تو ممکن نہ تھا مگر
حیرت کی جا ہے کیسے جیئے جا رہا ہوں مَیں

انجمؔ اجل قریب ہے لیکن نہیں خیال
کیا کیا عجیب کام کیئے جا رہا ہوں مَیں

*

○

جب عشق کی سوزش ہو دل میں گردش میں ستارا ہوتا ہے
اِس دَورِ مصیبت میں ہمدم ہر جور گوارا ہوتا ہے
دستورِ محبت کیا کہیئے یہ مبہم بھی ہے واضح بھی
جس شوخ پہ ہم مرتے ہیں وہی جینے کا سہارا ہوتا ہے
مت پوچھ تو ضبطِ گریہ کا انجام کہ ایسی حالت مَیں
ہر آہ غم آگیں ہوتی ہے ہر سانس شرارا ہوتا ہے
خود حُسن سے پوچھو بے تابی جلووں کی نمائش کرنے کی
پر عشق کا ذوقِ نظارہ بدنام بچارا ہوتا ہے
کھنچتا ہے کوئی جتنا انجم بڑھتا ہے اتنا شوق طلب
جو جتنا کنارہ کرتا ہے اتنا ہی وہ پیارا ہوتا ہے

*

○

یہ سوزِ اندروں تا کے یہ چشمِ خونفشاں کب تک
کسی کے عشق میں انجمؔ رہو گے خستہ جاں کب تک

زمینِ صحنِ گلشن پر رہے گا آسماں کب تک
یونہی گرتی رہیں گی بجلیوں پر بجلیاں کب تک

وہی افسانۂ غم ہے وہی رُودادِ الفت ہے
ہر اک سے ہم سنے جائیں گے اپنی داستاں کب تک

یہ شوقِ وصل اور یہ خوفِ رسوائی قیامت ہے
رہیں گے فاصلے یوں میرے تیرے درمیاں کب تک

کبھی تو ناوکِ گفتار چھوٹے، ٹوٹے خاموشی
یونہی کھنچتی رہے گی تیری چتون کی کماں کب تک

مری توبہ کے آنسو مے کے بدلے ڈھال دے ساقی
رہے گا منتظر آخر ہجومِ مے کشاں کب تک

بگوشِ ہوش اب پیری کی تم دستک سنو انجمؔ
طبیعت کی یہ شوخی اور یہ جولانیاں کب تک

غمِ حیات کی تفسیر برملا مت پوچھ
ترے فراق میں جو دل کا حال تھا مت پوچھ

خدا ہی جانے کہ کیوں سرد ہو گیا شعلہ
سحر چراغ سے کیا کہہ گئی صبا مت پوچھ

مآلِ عشق ہے ناکامیِ دلِ پُر درد
نہ پوچھ مجھ سے تعشق کی انتہا مت پوچھ

ترے ہی در پہ ہے کیوں اپنی ناصیہ سائی
ترے ہی کوچے کا میں کیوں بنا گدا مت پوچھ

ہر ایک اشک میں تصویرِ دوست دیکھی ہے
مرے جمالِ تصور کا ماجرا مت پوچھ

مرے جمود کا باعث ہے لغزشِ پیہم
کہاں کہاں ترا مے کش پھسل پڑا مت پوچھ

ہوائے دشت کی صورت گزر گیا انجم
کہاں سے آیا تھا وہ اور کہاں گیا مت پوچھ

*

○

تم نے کسی کا دل نہیں توڑا
سچ ہے کہ ہم نے ہی منہ موڑا

سب کو چھوڑا سب کو توڑا
جس دن تم سے ناطہ جوڑا

ختم ہوئی وہ لذتِ سوزش
ناحق آبلۂ دِل پھوڑا

تو ہی بتا اے جان کے دشمن
کس نے کس کا ساتھ ہے چھوڑا

غم اس کا بھی تھوڑا نہیں ہے
غم کہ بقدرِ ظرف ہے تھوڑا

سارے ساتھی بچھڑ گئے ہیں
غم نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا

ٹوٹا ہوا دل جڑ نہ سکے گا
صبر آئے گا تھوڑا تھوڑا

حالتِ دل تو سنبھل چکی تھی
آنکھ نے ابکے بھانڈا پھوڑا

○

جس طرف تیری نظر دیکھتا ہوں
بزمِ ہستی کو اُدھر دیکھتا ہوں

کیا دل کیسا جگر ہے اپنا
حسرتیں خاک بسر دیکھتا ہوں

ایک مدت سے بصد حسرت و یاس
میں تری راہگزر دیکھتا ہوں

گہ نشیمن کی بلندی پہ نظر
گاہ ٹوٹے ہوئے پر دیکھتا ہوں

آہ یہ ذوقِ خراباتیٔ عشق
اپنا اجڑا ہوا گھر دیکھتا ہوں

زندگی دردِ شبِ ہجراں ہے
پھر بھی آثارِ سحر دیکھتا ہوں

کارواں چل بھی چکا ہے انجم
مَیں ابھی رختِ سفر دیکھتا ہوں

○

لطف کی ان سے التجا نہ کریں — نہ کریں، ہم سے وہ وفا نہ کریں

معرفت ہے ودیعتِ ازلی — جو کریں بات عارفا نہ کریں

دل لگانا ہی ان سے ہے بے سود — وہ جو بھولے سے بھی بھلا نہ کریں

قلب مہجور اور ہم مجبور — ان کا ارشاد ہم گلا نہ کریں

حاصلِ غم ہے کیفِ لافانی — چارہ جُو درد کی دوا نہ کریں

جانتا ہوں حقیقتِ اظہار — آپ اس دِل کا فیصلا نہ کریں

اپنی رسوائی آپ کی شہرت — کیوں نہ تازہ وہی فسانہ کریں

دل ہے اپنا ہی شائقِ تخریب — ورنہ یوں بجلیاں گرا نہ کریں

راز افشا نہ ہو کہیں انجم
آپ انکار برملا نہ کریں

✱

○

یقیں نہ جس کا تھا وہ آزما کے دیکھ لیا
فریبِ ہستیٔ موہوم کھا کے دیکھ لیا
نہ اپنے ذوقِ عبادت کی ہو سکی تسکیں
ہر آستاں پہ جبیں کو جھکا کے دیکھ لیا
ہر ایک کہتا ہے میری حکایتِ غم ہے
فسانۂ غمِ ہستی سُنا کے دیکھ لیا
ہے وصل اصل میں پیغامِ مرگِ جذبۂ عشق
یقیں تو نہ تھا مگر آزما کے دیکھ لیا
دِلِ حزیں میں اُمیدوں نے کروٹیں بدلیں
جو اُس نے بھولے سے ہی مسکرا کے دیکھ لیا
شکستگی مرے دِل کی اُسے نہ تھی منظور
عتاب کر کے ذرا مسکرا کے دیکھ لیا

بلا کے حسن نے خود دعوتِ تماشا دی
عجب یہ کھیل سرِ طُور جا کے دیکھ لیا

فقط حجابِ نظر ہے وجود ہو یا عدم
خود اپنی ذات کو ہم نے مٹا کے دیکھ لیا

اب آرزو ہے کہ ناکامِ آرزو ہی رہوں
وگرنہ جس کو بھی چاہا تھا پا کے دیکھ لیا

مقامِ دار و رسن تک پہنچ گئے انجم
حقیقتوں سے جو پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا

*

○

بزم میں جب بھی کوئی شعلہ زباں اٹھتا ہے
دل میں کچھ اپنے ہی پیکر کا گماں اٹھتا ہے

اشک تھم جائیں پر آہیں تو رہیں گی کچھ دیر
آگ بجھ جائے تو کچھ دیر دھواں اٹھتا ہے

جو مقرب تھے امانت بھی انہیں کو دیتے
ہم گنہگاروں سے کب بارِ گراں اٹھتا ہے

تیری یادوں سے ہی معمور تھا وہ گوشۂ دل
اب جنوں خیز بگولہ سا جہاں اٹھتا ہے

مرگ ہی کھینچ کے لے جائے اُسے سوئے عدم
بزمِ ہستی میں جو آ بیٹھے کہاں اٹھتا ہے

منتظر بیٹھے ہیں ہم صُبحِ ازل سے انجم
دیکھیں کب پردۂ اسرارِ جہاں اٹھتا ہے

*

○

سوسن سے گُل سے لالہ سے اور نسترن سے دُور
کتنی گزار دی ہیں بہاریں چمن سے دُور

اب کیا کریں شکایتِ اہلِ وطن ندیم
قسمت میں تھا یہی کہ رہیں ہم وطن سے دُور

پیش آئیں راہِ عشق میں ایسی بھی واردات
جن کا بیان ہے طاقتِ شعر و سخن سے دُور

اِس وقت مرگ و زیست کے انداز اور ہیں
تیشہ کہاں ہے ورنہ کسی کوہکن سے دُور

ضدّین مل سکیں کبھی باہم، محال ہے
یزداں کے ہے قریب جو ہے اہرمن سے دُور

ممکن ہے پا سکیں اُسے ہم فیضِ عشق سے
جو رُوح کے قریب ہے جو ہے بدن سے دُور
ہر چند سومنات کے مندر گرا دیئے
جو دل میں تھا صنم نہ ہوا بت شکن سے دور
ہیں مُدّعی مقامِ انا الحق کے آج ہم
انجؔم ہیں گرچہ منزلِ دار و رسن سے دُور

*

○

لکھ رہا ہوں پھر کہ نالہ کش سرِ خامہ ہے
مدتیں گزریں کہ مجھ کو انتظارِ نامہ ہے
عالمِ فانی سمجھ گر ہے سکوتِ مستقل
بزمِ ہستی ہر گھڑی منت کشِ ہنگامہ ہے
تار ہائے پیرہن تھے چند اب وہ بھی نہیں
جامۂ عریانی اپنے جسم کا اب جامہ ہے
موت کی ہچکی میں جو نغمات ہیں اُن کو بھی سُن
اے کہ دل تیرا بہت شیدائے چنگ و چامہ ہے
نغز گو شاعر ہے صوفی بھی ہے اور دیوانہ بھی
انجمِ آشفتہ کے حق میں یہ رائے عامہ ہے

○

گاہ ساقی سے گہے صبا سے پیمانے سے
اب تعلق ہے اگر کچھ تو ہے میخانے سے

تم کبھی دیدۂ بینا سے بھی دیکھو ان کو
اہلِ دل یوں تو نظر آتے ہیں دیوانے سے

یہ جہاں کیا ہے فقط کشمکشِ موت و حیات
داستاں ختم ہوئی سانس اکھڑ جانے سے

چند قطرات سے تھی شورشِ طوفاں برپا
دِل کو تسکیں ہوئی اشکوں کے اُمڈ آنے سے

مسکنِ لالہ و گل ہے چمنستاں اپنا
ہم جنوں والے گریزاں نہیں ویرانے سے

کعبۂ دل میں سجائے ہیں حرم والوں نے
بُت کہ لائے گئے مغرب کے صنم خانے سے

ذرے ذرے میں ہے اس حسنِ ازل کا پرتو
وہ نہ منسوب ہے کعبے سے نہ بتخانے سے
منحصر قوتِ بازو ہی پہ ہے کسبِ کمال
رکھ نہ اُمید کسی خیر کی بیگانے سے
قافلے والے کہاں ہونگے خبر کیا انجمؔ
فاصلے پڑ گئے کیا اِک گھڑی رک جانے سے

○

دوستو لینا کہ آنے لگا پھر ہوش مجھے
ساقیا ساقیا دے بادۂ سر جوش مجھے

زیب دیتا ہے کہاں پیرہنِ ہوش مجھے
میری فطرت نے بنایا ہے جنوں پوش مجھے

ماجرائے غمِ الفت تو بیاں ہو نہ سکا
بات ایسی ہی تھی رہنا پڑا خاموش مجھے

ہجر میں دل کو اب اُمیدِ کرم بھی نہ رہی
کر دیا آپ نے کیوں آہ فراموش مجھے

یوں غمِ عشق سے چھوٹا ہوں کہ مے خانے میں
اب تو آٹھوں پہر آتا ہی نہیں ہوش مجھے

نہ پئے جا سکے دو اشک تو مجھ سے انجمؔ
لوگ کہنے کو تو کہتے ہیں بلانوش مجھے

○

کیا کیا اثر تھا گریۂ بے اختیار کا
راز ان پہ کھل گیا دلِ غفلت شعار کا

قائل ہے کون گردشِ لیل و نہار کا
"گاتے ہیں ہم ترانہ خزاں میں بہار کا"

ڈر مجھ کو اب نہیں ہے گناہوں کے بار کا
اِک آسرا ہے بخششِ پروردگار کا

پہلے کی جو تھی بات وہ اب بات ہی کہاں
بے حال، حال اب ہے دلِ بے قرار کا

قدرت بنی ہے باعثِ ترغیبِ مے کشی
بے وجہ کب ہے جھومنا ابرِ بہار کا

اُس سے کبھی حقیقتِ فردا نہ پوچھئے
خوگر جو ہو چکا ہے غمِ انتظار کا

میرے حریمِ غم میں چراغاں ہوا تو ہے
احساں ہے مجھ پہ دیدۂ خونابہ بار کا

پھر آمدِ بہار ہے جانے ہو طور کیا
دستِ جنوں کا اور گریباں کے تار کا

انجم کسے خبر تھی کہ عالم میں لطف کے
اُن سے چھڑائے گا مجھے غم روزگار کا

○

نہ پوچھ اے ساقیِ محفل ترے جانے پہ کیا گزری
سبو و جام پر کیا بیتی مے خانے پہ کیا گزری

تڑپنا برق کا اور اس کا گرنا سب نے دیکھا ہے
کسی نے یہ نہ جانا میرے کاشانے پہ کیا گزری

بیانِ حال پر میری تغافل کیشیاں ان کی
نہ پوچھو ہم نشیں یوں مجھ کو تڑپانے پہ کیا گزری

مآلِ سوزِ الفت شمع کو معلوم کیا ہوگا
کہ سوزِ عشق سے جل جل کے پروانے پہ کیا گزری

وہ نظارہ بھی تھا تفریح گویا اہلِ ساحل کو
ہمیں پوچھو سفینہ غرق ہو جانے پہ کیا گزری

○

اہلِ خرد نہ آج تک ڈھونڈ سکے جوازِ عشق
فکرِ بشر سے ماورا، کچھ ہے اگر تو رازِ عشق

عہدِ شباب ہی کے ساتھ ولولے دل کے چل دیے
آہ وہ گریہ ہائے شب ہائے وہ سوز و سازِ عشق

زورِ جنونِ عشق سے قائم جمالِ کائنات
وجہِ کمالِ کائنات نغمۂ جاں نوازِ عشق

آج ہے خار خار کو گل سے برابری کا شوق
بوالہوسی کے دور میں کیا رہا امتیازِ عشق

قرب کی خواہشیں شدید، ان کا مسلسل اجتناب
عشق فدائے نازِ حسن، حسن ہے بے نیازِ عشق

قیس ہو یا ہو کوہکن، انجمِ خستہ کے سوا
کر نہ سکا خلوص سے کوئی ادا نمازِ عشق

✱

انساں کسی ہستی کا بھی قائل نہ ہوا تھا
جب تک کہ وہ خود اپنا مقابل نہ ہوا تھا

آلامِ زمانہ میں گرفتار رہا دل
جب تک وہ غمِ دوست کے قابل نہ ہوا تھا

جب تک تجھے پایا نہ تھا کھویا نہ تھا میں نے
اِک درد تھا سینے میں مگر دل نہ ہوا تھا

تھا حسن جو تنہا، تو بنا عشق کا خالق
صد شکر کہ آپ اپنے پہ مائل نہ ہوا تھا

ہم نے بھی گزر گاہِ تصور میں لیا دیکھ
وہ شوخ اگر رونقِ محفل نہ ہوا تھا

گلچیں کے عزائم سے تو واقف ہی تھے سب گل
گو باغ میں کچھ شورِ عنادل نہ ہوا تھا

جب تک نہ اٹھائے تھے قدم راہِ طلب میں
انجمؔ ہمیں اندازۂ منزل نہ ہوا تھا

○

کس کو سمجھائیں کہیں کس سے کہ کیا گزری ہے
آپ جو سمجھے ہیں اُس سے بھی سوا گزری ہے

پیش رو جو تھے وہ اب پیچھے ہیں مانندِ غبار
تیز پا کتنی زمانے کی ہوا گزری ہے

رہ گیا دیدۂ دل سینے میں خیرہ ہو کر
یوں تصوّر میں کوئی ماہ لقا گزری ہے

ہم نے سمجھا کہ درِ دل پہ ہے تیری دستک
پردۂ گوش سے جب چھو کے صبا گزری ہے

کچھ تو آوازِ درا دوشِ ہوا پر آتی
قافلے والوں پہ کیا جانئے کیا گزری ہے

کون سے غم نے کیا ہم کو نہ انجمؔ پامال
اپنی ہی سمت سے ہر راہِ خطا گزری ہے

کیا کیا تھی رذالت کہ شرافت نظر آئی
جو شعبدہ بازی تھی کرامت نظر آئی

یاروں سے عبث ہم کو رہی چشمِ رفاقت
اغیار کی محفل ہی غنیمت نظر آئی

دِل میں تری تصویر ہوئی اور نمایاں
جب بھی کوئی من موہنی مورت نظر آئی

کیوں اجنبی راہوں میں سراپا ترا دیکھا
کیوں حشر سے پہلے یہ قیامت نظر آئی

تو پرسشِ احوال کو آیا سرِ بالیں
صد شکر ترے ملنے کی صورت نظر آئی

اس مصلحت اندیش زمانے میں ہر اک سمت
یاروں کو جہالت میں بھی حکمت نظر آئی

○

بُت خانۂ تشکیک وہی سر نظر آیا
جس سر پہ بھی دستارِ فضیلت نظر آئی

ہر مرحلہ گو تازیٔ ہمت کو ہے مہمیز
ہر مرحلہ، اِک تازہ مصیبت نظر آئی

انعام نہ پایا کوئی شایانِ مشقت
تسخیر کی منزل پہ ہزیمت نظر آئی

جھانکا نہ کبھی اپنے نہاں خانۂ دِل میں
گو چاروں طرف ہی تری قدرت نظر آئی

زندانیٔ اوہام تھے زنجیرِ نفس سے
جب قید سے چھوٹے تو حقیقت نظر آئی

افسوس کہ ہر کوششِ اظہار میں انجم
الفاظ و معانی کی عداوت نظر آئی

✱

○

مضطر ہیں گرچہ سوزشِ زخمِ نہاں سے ہم
پر کیا کریں بتا نہیں سکتے زباں سے ہم

کس کس نہ آستاں پہ صدا ہم نے دی مگر
منسوب ہیں ہنوز اُسی آستاں سے ہم

سب کا مشاہدہ ہے کسی کو یقیں نہیں
اِک روز جائیں گے وہیں آئے جہاں سے ہم

اب کارواں کی بات کریں بھی تو کیا کریں
بچھڑے ہوئے ہیں گردِ رہ کارواں سے ہم

اہلِ زمیں نے رنج دئے رنگ رنگ کے
بے سود عرض کرتے رہے آسماں سے ہم

منزل کی ہے خبر نہ ٹھہرنے کا اختیار
اِک تیر ہیں کہ نکلے ہوئے ہیں کماں سے ہم

انجم قمار خانۂ ہستی میں کس کی جیت
دھو آتے ہاتھ سب کی طرح نقدِ جاں سے ہم

○

حکمت و فلسفہ کی بحث میں رکھا کیا ہے
دیکھنا یہ ہے کہ مقصودِ تمنا کیا ہے
بیچ دی عمر دنانیر و دراہم کے عوض
کسے معلوم کہ ہستی کا تقاضا کیا ہے
مظہرِ حق ہے وہ ذرہ ہے کوئی یا خورشید
چشم بینا ہو تو کیا کعبہ، کلیسا کیا ہے
اے بُتِ غرب کے، اے لعبتِ چیں کے شیدا
کبھی دیکھا بھی سوادِ رُخِ لیلا کیا ہے
خواہش مرگ کے باوصف جیے جاتے ہیں
اتنا مشکل ہو اگر جینا تو مرنا کیا ہے

ہم تہی کیسہ تھے مانندِ گدا پھرتے رہے
ہم نے بازارِ محبت سے خریدا کیا ہے

خضر و الیاس و مسیحا نے بتایا نہ ہمیں
عرصۂ زیست میں اُلفت کا مداوا کیا ہے

آبِ کوثر کے طلب گار بنے ہو انجمؔ
کبھی دیکھو تو سہی تلخیٔ صہبا کیا ہے

○

یاد آتا ہے ٹوٹا ہوا پیمان کسی کا
ممنون ہے اپنا دِل ویران کسی کا

اُس شوخ کو ہے حسن نمائی سے فقط کام
ہوتا ہے تو ہوتا رہے نقصان کسی کا

آواز نہ ہچکی کی بھی آئے سرِ مقتل
اِک اور یہ جاری ہوا فرمان کسی کا

بسمل تھے مگر رحم کے طالب نہ ہوئے ہم
ہم سے نہ اُٹھایا گیا احسان کسی کا

اس دور کے ہر وحشیِ ہشیار کے صدقے
گر ہاتھ ہے اپنا تو گریبان کسی کا

بیگانۂ احساس ہیں گلچین و عنادل
ہر ایک سے ہے سمجھا ہے گلستان کسی کا
ہم کس پہ بھروسہ کریں شکوہ کریں کس سے
نے عہد ہی قائم ہے نہ ایمان کسی کا
اس عتبۂ عالی پہ رسائی ہو تو کیوں کر
ہر دم ہے کھڑا تاک میں دربان کسی کا
ہاں جس کے لیے دیدہ و دل فرش ہوئے تھے
انجمؔ ہوا وہ دوست بھی مہمان کسی کا!

○

بستی بستی گھوم چکے ہیں صحرا صحرا چھانے ہیں
مدّت بعد اپنی ہستی کو ہم قدرے پہچانے ہیں

انہیں سے رونقِ دنیا قائم، انہیں سے باقی زیست میں رنگ
شکر ہے بزمِ ہستی میں کچھ لوگ ابھی دیوانے ہیں

آج جہاں ہے جشنِ مسرت کل وہاں شہرِ خموشاں تھا
کل سجتی تھی محفل جس جا آج وہاں ویرانے ہیں

ہم نے تیرا ذکر کیا تو ہم پہ قیامت ٹوٹ پڑی
ہر لبِ خاص و عام پہ ورنہ رقصاں تیرے فسانے ہیں

آخر کار مقدر سب کا خامشی، ظلمت اور جمود
شکر کرو اِک شمع ہے روشن گردش میں پیمانے ہیں

ہر اک سے ہم پوچھ رہے ہیں کچھ تو بتاؤ ہم ہیں کون
اپنا تشخص کیسے کریں جو اپنے سے بیگانے ہیں
رنج و مشقت، لطف و مسرّت، انجم کو سب کچھ منظور
پارچۂ ہستی میں یہ تقدیر کے تانے بانے ہیں

○

غم ہائے روزگار کے قابل بنا دیا
دل کب تھا آپ نے ہی اسے دل بنا دیا

دونوں جہاں کی وہ ہے گدائی سے بے نیاز
جس کو خدا نے حُسن کا سائل بنا دیا

تھا وعدۂ الست کہ شرطِ عبودیت
ہستی نے ایک ایک سے غافل بنا دیا

تقلیدِ غرب نے کیا بیگانۂ جنوں
تن کو سجا کے رُوح کو بسمل بنا دیا

پوشیدہ تھی نظر سے عصائے کلیم میں
وہ ضرب جس نے موج کو ساحل بنا دیا

اُس رہ نوردِ شوق کا مت پوچھئے مقام
منزل کو جس نے جادۂ منزل بنا دیا

انجم جو سینۂ صدفِ حق میں بند تھا
قدرت نے اُس گہر کو مرا دل بنا دیا

*

مکاں سے ماورا اقلیمِ مومن لامکاں تک ہے
غلط سمجھا جو کہتا ہے یہاں تک ہے وہاں تک ہے

تری جا ہے مقامِ سدرہ و طوبیٰ سے بھی آگے
کہا کس نے تری پرواز شاخِ آشیاں تک ہے

نہ دیکھو خار کو اے گُل پرستو کم نگاہی سے
تماشائے نگارِ گُل، بہارِ گلستاں تک ہے

حضورِ حق جبیں سائی کی لذت کس طرح سمجھیں
کہ اپنی تو رسائی ہی بتوں کے آستاں تک ہے

نگاہیں کارواں کو ڈھونڈنے نکلیں گی؟ ناممکن
کہ پروازِ تخیل گردِ راہِ کارواں تک ہے

بھرے بازار میں لُٹ جائیں گے وہ کم نظر سارے
کہ جن کی فکر بس نفع و ضرر، سود و زیاں تک ہے

رنگے جائیں نہ کیوں ہم مغربی تہذیب میں انجم
کہ ہر اسلوب تقلیدِ حدیثِ دیگراں تک ہے

○

درتک ترے اِک روز رسائی تو ملے گی
کچھ بھی نہ سہی ناصیہ سائی تو ملے گی
ڈھونڈو تو سہی کعبہ و بتخانے میں جاکر
وہ خود نہ ملے اس کی خدائی تو ملے گی
اُس سے جو تعلق ہے بہر طور رہے گا
گر وصل نہیں ہے تو جدائی تو ملے گی
ہیں دشتِ تجسس میں جو گم گشتہ انہیں بھی
منزل کی طرف آبلہ پائی تو ملے گی
دربارِ ازل سے کوئی خالی بھی گیا ہے
میری نہ سہی ہم کو گدائی تو ملے گی

اجزائے پریشاں میں بھی لازم تو ہے کچھ ربط
اس جلوۂ کثرت میں اکائی تو ملے گی
دوزخ ہی سہی گر نہیں جنت کا مقدر
اس عالمِ برزخ سے رہائی تو ملے گی
انجمؔ ہی کو رکھے گا بھلا کس لیے محروم
ساقی نے اگر سب کو پلائی تو ملے گی

○

شیرازۂ نگاہ پریشاں ہے اندنوں
دل پھر رہینِ گردشِ دوراں ہے اندنوں
یکسر گراں، حیات کے اکثر لوازمات
دیکھا تو جنسِ موت ہی ارزاں ہے اندنوں
جو فرق تھا بہار و خزاں میں وہ مٹ گیا
کیا خوش عیار نظمِ گلستاں ہے اندنوں
صحنِ چمن میں ہر رگِ گل دام بن گئی
رُخ بلبلوں کا سوئے بیاباں ہے اندنوں
گو آشیاں نہیں ہے ٹھکانا تو ہے مرا
جینا قفس میں کس قدر آساں ہے اندنوں

مسدود زندگی کی ہیں راہیں تمام تر
ہر ہر قدم پہ دار درِ زنداں ہے اندنوں
کس کو پکاریے، تو گلہ کس سے کیجئے
ہاں اپنا ہاتھ اپنا گریباں ہے اندنوں
انجمؔ عجب ہیں اہلِ نظر کے تغیرات
کل تک جو کفر تھا وہی ایماں ہے اندنوں

عجیب یہ وقت آ گیا ہے کہ بلبلوں سے ہے باغ خالی
دو نیم ہے شاخِ آشیانہ جو رہ گئے ہیں تو زاغ خالی

بس ایک اُجڑی محبتوں کا نشان قائم ہے اور ہم ہیں
کبھی یہاں دِل کی بستیاں تھیں پر اب ہے سینے میں داغ خالی

اِک اجنبی رندمے کدے میں گھس آیا ہے اب خدا بچائے
پُرانے رندوں کے پاس رکھا ہی کیا تھا جز اک ایاغ خالی

مری گنہگار آنکھ کو ہی نظر نہ آیا جو ہر طرف تھا
مری نظر میں چمن بھی خالی ہے اور کہسار و راغ خالی

فتیلۂ جاں کو روغنِ خوں میں تر کریں گے تو جل اُٹھے گا
مکانِ ہستی میں مدتوں سے پڑا ہے دل کا چراغ خالی

وہ کون ہو گا سنے گا اپنی جو داستانِ شکستہ انجمؔ
کہیں تو کس سے کہیں کہ اپنے حواس گم ہیں دماغ خالی

○

نہ تھی تابِ تماشا گرچہ وہ بالائے بام آیا
ہوئے ہم سر بہ سجدہ جب کبھی وقتِ قیام آیا

بہت مدّت سے دل میں حسرتِ عرضِ تمنا تھی
ہوا تو ملتفت تو بس لبوں پر تیرا نام آیا

ہوئی مدّت وہ سارے اُٹھ گئے جو جانِ محفل تھے
ہمارے ہاتھ میں صد حیف کیسے وقت جام آیا

پُرافشاں تھا خیالستانِ بے الفاظ میں کب سے
بڑی مشکل سے آخر مرغِ معنی زیرِ دام آیا

کہاں اقبالؔ سا مہرِ درخشاں اور کہاں انجمؔ
مگر پرتو اُسی کا ہے جو قدرے نا تمام آیا

*

مُتفرّقات

ہم کو محسوس ہر گھڑی ہو گی — کیا نمایاں تری کمی ہو گی
تو نے چھوڑا ہمیں تو کیا غم ہے — اب ترے غم سے دوستی ہو گی
کس نے سمجھی یہ بات جیتے جی — زندگی اتنی عارضی ہو گی

○

کچھ تو احساس ہو تم مرے پاس ہو — کاش آواز دے کے بُلا لو مجھے
علم و دانش کے مدفن میں مدفون ہوں — مَیں ہوں زندہ نکالو نکالو مجھے
لفظ کی جستجو میں معانی گئے — میری گمراہیوں سے بچا لو مجھے
پائے چوبینِ منطق ہیں نازک بہت — گر رہا ہوں سنبھالو سنبھالو مجھے
آبِ حیواں ہے گر چاہ ظلمات میں — پھینک دو ظلمتوں میں اُجالو مجھے
شکلِ عفریت چاٹا بہت ذہن کو — چھوڑ دو اب تو میرے خیالو مجھے

○

خود بخود فطرت اُسے سکھلا رہی ہے شوخیاں
آفتِ معصوم پر شاید شباب آنے کو ہے
اللہ اللہ پھر چھلک جانے کو ہے جامِ شکیب
کیا مرے ہاتھوں میں پھر جامِ شراب آنے کو ہے
زندگی سستا رہی ہے وادئ عشرت میں آج
کون جانے موت بھی پا در رکاب آنے کو ہے
اہتمامِ ساقئ و صہبا و خوباں کیجیے
سُن رہے ہیں انجمن خانہ خراب آنے کو ہے

○

جنوں کا ساتھ دو تحقیرِ دانائی کرو فوراً
بہار آنے کو ہے اب دشت پیمائی کرو فوراً

اٹھو ایسا نہ ہو کہ حسن پر الزام آ جائے

دمِ آخر ہے عاشق کا مسیحائی کرو فوراً

بجا ہے جذبِ دل لیکن یہ ہے کیسی تن آسانی

وہ خود آتے ہیں اب بڑھ کے پذیرائی کرو فوراً

فرازِ عرش سے دل میں مضامیں ڈھلتے جاتے ہیں

کہیں ان کو نہ کھو دو خامہ فرسائی کرو فوراً

ضیائے جلوۂ خوباں ہے تو ہر سمت ہی انجم

خدارا تم علاجِ ضعفِ بینائی کرو فوراً

O

وہی اک جستجو سی ہے اک وہی کرب سا پیہم

تصور میں ترے راتوں کو اب بھی سو نہیں سکتا

دبی جاتی ہیں لاکھوں حسرتیں سینے کے مدفن میں

کہ رونے کی بھی خواہش ہو تو اب میں رو نہیں سکتا

O

ہاں ساحلِ خوشی بھی بہت دُور تو نہیں

کیجے تو غرق کشتیٔ غم کو شراب میں

نظارۂ جمالِ جہاں تاب دیکھ لیں

وہ تند خو جو آئے کبھی پھر عتاب میں

○

مصحفِ آلام کی تفسیر بن کر رہ گئی
"زندگی اِک درد کی تصویر بن کر رہ گئی"

دل بھر آیا ہاتھ دامن سے الجھ کر رہ گئے
میری وحشت ہی مری زنجیر بن کر رہ گئی

نالہ کر کے بھی طبیعت کو سکوں ملتا نہیں
ساری کوشش آہ بے تاثیر بن کر رہ گئی

○

آپ نے کچھ نہ کہا پھر بھی وہ اندازِ سکوت
ایسے گویا تھا کہ خود بول رہے ہوں گویا

کشتِ اُمید بھلا کاٹیں گے کیسے انجم
تخمِ محرومی شبِ غم میں جو ہم نے بویا

○

سارا عالم ہے ایک گورستاں
ہم یہ مدّت کے بعد پہچانے

پُر ہے لاشوں سے سینۂ گیتی
شہر بھی اصل میں ہیں ویرانے

موت کے قافلے میں ہم بھی ہیں
بس ذرا رک گئے ہیں سستانے